خصوصی اشاعت
انٹرنیشنل امام احمد رضا
کانفرنس
صفر ۱۴۱۲ھ مطابق ستمبر ۱۹۹۱ء
بمقام کراچی، لاہور، اسلام آباد
گلشنِ رضا
رحمۃ اللہ علیہ
ترتیب
حافظ محمد طاہر رضا
رضا اکیڈمی (رجسٹرڈ) لاہور
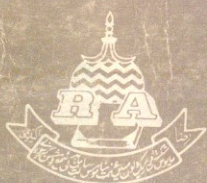
سلسلہ مطبوعات نمبر ۵۳

نام کتاب ——— گلشن رضا

تصنیف ———

ناشر ——— رضا اکیڈمی

مطبع ——— احمد سجاد آرٹ پریس ہوسپٹل روڈ لاہور

ھدیہ ——— دعائے خیر بحق معاونین رضا اکیڈیمی رجسٹرڈ لاہور

عطیات بھیجنے کے لیے

رضا اکیڈمی اکاؤنٹ نمبر ۹۳۸/۳۸، حبیب بنک

وسن پورہ برانچ لاہور

بذریعہ ڈاک طلب کرنے والے حضرات پانچ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کریں!!

مِلنے کا پتہ

رضا اکیڈمی رجسٹرڈ مسجد رضا محبوب روڈ چاہ میراں لاہور پاکستان

کوڈ نمبر ۵۴۹۰۰، فون نمبر ۲۵۰۴۴۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

ایک ہمہ جہت شخصیت

مولانا کوثر نیازی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدیم

پاکستان کے سابق وزیر مذہبی امور اور اقلیتی امور جناب مولانا کوثر نیازی ملک کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وہ میدان صحافت اور میدان سیاست کے شہسوار ہیں انھوں نے زمانہ کے نشیب و فراز دیکھے ہیں وہ شاعر و ادیب بھی ہیں ؎

اللہ اللہ ہستی شاعر قلب غنچہ کا آنکھ شبنم کی

امام احمد رضا کو پرکھنے کے لیے ایسے ہی دل کی ضرورت تھی جو سچی بات کو سننے اور کہنے کی صلاحیت رکھتا ہو جو جانب دار و طرف دار نہ ہو جو سخت دل سخت جان سخت گیر نہ ہو جو خدا لگتی کہتا ہو ع

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

مولانا کوثر نیازی نے یہ مقالہ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا (کراچی) کی سرپرستی میں 14 ستمبر 1990ء کو تاج محل ہوٹل (کراچی) میں منعقد ہونے والی امام احمد رضا کانفرنس میں پڑھا تھا جو کانفرنس میں پسند کیا گیا اور سراہا گیا راقم بھی اس کانفرنس میں شریک تھا اور مولانا سے پہلی مرتبہ اسی کانفرنس میں ملاقات بھی ہوئی۔

یہ مقالہ بعض اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہے ادارہ معارف نعمانیہ لاہور نے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے اور اب ادارہ تحقیقات امام احمد رضا اردو کے علاوہ اس کا عربی اور انگریزی ترجمہ بھی شائع کر رہا ہے۔

مولانا کوثر نیازی امام احمد رضا کے عقیدت مندوں میں نہیں انھوں نے امام احمد رضا کے بارے میں جو کچھ لکھا اپنے ذاتی مطالعے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر لکھا ہے اس لیے ان کے خیالات وقیع معلوم ہوتے ہیں اور امام احمد رضا پر کام کرنے والوں کے لیے رہنما ثابت ہو سکتے ہیں۔

مولانا کوثر نیازی مقالے کے آغاز ہی میں یہ چونکا دینے والا فیصلہ فرماتے ہیں ۔:

"برصغیر میں یوں تو کئی جامع الصفات شخصیات گزری ہیں مگر جب ایک غیر جانب دار مبصر ان سب کا جائزہ لیتا ہے تو جیسی ہمہ صفت شخصیت امام احمد رضا کی نظر آتی ہے ویسی کوئی دوسری نظر نہیں آتی (امام احمد رضا خاں بریلوی ہمہ جہت شخصیت، مطبوعہ لاہور **1990**ء ص **4**)

راقم کے استاد گرامی اور ملک کے مایہ ناز محقق پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (صدر شعبہء اردو سندھ یونیورسٹی) نے بھی امام احمد رضا کے بارے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا تھا اس میں شک نہیں کہ جس نے امام احمد رضا کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا وہ اسی نتیجہ پر پہونچے گا ع

بے مثالی کی ہے مثال وہ حسن
خوبیٔ یار کا جواب کہاں

لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ ایسی عظیم شخصیت بدگمانیوں اور الزام تراشیوں کے غبار میں چھپادی گئی تھی اور مزید المیہ یہ کہ یہ کام مخالفت کی بنا پر بعض اہل علم نے جان بوجھ کر کیا بہر حال یہ غبار اب چھٹ گیا ہے اور امام احمد رضا پر ایشیاء، افریقہ، امریکہ اور یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔

امام احمد رضا پر مخالفین نے بہت سے الزامات لگائے سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ امام احمد رضا بریلوی خاں ایک فرقہ کے بانی تھے مولانا کوثر نیازی اس خیال سے متفق نہیں معلوم ہوتے چنانچہ لکھتے ہیں:

"بد قسمتی سے ہمارے ہاں اکثر لوگ انہیں بریلوی نامی ایک فرقے

کا بانی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اپنے مسلک کے اعتبار سے صرف حنفی
اور سلفی ہیں" (ص 6)

کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) کی فاضلہ ڈاکٹر اوشا سایال (جنہوں نے بریلوی تحریک پر ڈاکٹریٹ کیا ہے) سے جب راقم نے یہ کہا کہ "بریلوی فرقہ نہیں ہے" تو وہ چونک گئیں اور حیرت سے منہ تکنے لگیں جب سمجھایا تو فکر میں پڑ گئیں اصل میں یہ حقیقت آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی کیوں کہ عام تاثر یہی ہے کہ بریلوی ایک فرقہ ہے جس کے بانی امام احمد رضا تھے بقول ابو یحیی امام خاں نوشہروی حضرات اہل حدیث نے اہلِ سنت کو یہ لقب عطا فرمایا تھا پھر اہل سنت نے اس لقب کو قبول کرتے ہوئے اپنایا اور بریلوی مشہور ہو گئے حالانکہ ع

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

ماضی میں سلف صالحین کی یہی شان تھی اسی لئے مولانا کوثر نیازی نے امام احمد رضا کو سلفی کہا ہے پھر رفتہ رفتہ گردش دوراں کے مارے اصل سے جدا ہو کر ٹکڑیوں میں بٹ گئے یہ ایک قومی المیہ ہے جس نے ملت اسلامیہ کی ساکھ کو سخت نقصان پہونچایا ہے اب ہر کوئی فکر مند ہے لیکن اس کو نہ تشخیص سے غرض ہے اور نہ تجویز و علاج سے ع

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

امام احمد رضا پر دوسرا الزام یہ تھا کہ وہ بدعتی ہیں اور انہوں نے بدعات کو بہت فروغ دیا ہے یہ بات اتنی مشہور کر دی گئی کہ لوگ یقین کرنے لگے حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے مولانا کوثر نیازی نے اپنے مقالے میں ایسے شواہد پیش کئے ھیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام احمد رضا نے تو بدعات کی سرکوبی کی ہے مولانا حیرت سے کہتے ہیں:

"کیا ستم ظریفی ہے کہ جو رد بدعات میں شمشیر برہنہ تھا اسے خود

حامی بدعات قرار دیا گیا" (ص 5)

امام احمد رضا پر تیسرا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ تکفیر مسلم کے عادی تھے جس کو چاہا کافر کہہ دیا حالانکہ یہ بات خلافِ حقیقت ہے بلکہ جو حضرات اس قسم کے الزامات لگاتے ہیں ان کے محبوب قائدین نہ صرف تکفیر مسلم سے داغدار ہیں بلکہ خون مسلم سے بھی داغدار ہیں یہ ایک خونچکاں حقیقت ہے جس کو چھپایا جاتا ہے اپنی غلطیوں کی پردہ پوشی کا یہ طریقہ نکالا کہ امام احمد رضا کو موردو الزام ٹھہرایا بہرحال اس سلسلے میں مولانا کوثر نیازی نے بڑی دل لگتی بات کہہ دی ہے. ان کے نزدیک امام احمد رضا کے فتوی تکفیر کا اصل محرک عشق رسول تھا اسی لئے جن حضرات کی گستاخیٔ رسول کی بنا پر امام احمد رضا نے تکفیر کی خود انھوں نے ان کے اس جذبے کو سراہا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا ادریس کاندھلوی کے تاثرات وخیالات پڑھ کر اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ع

مرتا ہوں اس آواز پر ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہیں جائیں کہ "ہاں اور"

مولانا کوثر نیازی لکھتے ہیں۔

"وہ فنافی الرسول تھے اس لیے ان کی غیرت عشق احتمال کے درجے میں بھی توہین رسول کا کوئی خفی سے خفی پہلو بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھی" (ص 7)

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"ادب واحتیاط کی یہی روش امام رضا کی تحریر وتقریر کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے (۔ص 8)

اور آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"مخالفین جس بات کو شاہ احمد رضا کا تشدد کہتے ہیں، وہ تشدد نہیں،

ان کا عشق رسول ہے ان کا ادب و احتیاط ہے جو فتوی نویسی سے
لے کر ترجمہ قرآن تک اور ترجمہ قرآن سے لے کر ان کی نعتیہ
شاعری تک ہر جگہ آفتاب و مہتاب بن کر ضو فشانی کر رہا ہے۔
(ص 12)

مولانا کوثر نیازی نے جو بات کہی دلیل کے ساتھ کہی - ترجمہ قرآن کے سلسلے میں انہوں
نے مولانا محمود حسن دیوبندی، مولوی عبد الماجد دریا آبادی، اور مولانا ابو اعلی مودودی کے
تراجم سے امام احمد رضا کے ترجمہ قرآن کا تقابل کرتے ہوئے اپنے موقف کو ثابت
کیا ہے - اس کے باوجود بعض اسلامی ممالک میں امام احمد رضا کے ترجمہ قرآن پر
پابندی لگانا اور سلمان رشدی کی گستاخیوں پر خاموشی اختیار کرنا مولانا کے لیے سخت
حیران کن ہے - حیرت سے پوچھتے ہیں :-

"کیا ستم ہے کہ فرقہ پرور لوگ رشدی کی ہفوات پر تو زبان
کھولنے سے اور عالم اسلام کے قدم قدم کوئی کاروائی کرنے میں
اس لیے تامل کریں کہ کہیں آقایان ولی نعمت ناراض نہ ہو جائیں
مگر امام احمد رضا کے اس ایمان پرور ترجمے پر پابندی لگا دیں جو
عشق رسول کا خزینہ اور معارف اسلامی کا گنجینہ ہے (-ص 9)

اصل میں آقایان ولی نعمت گستاخیوں کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں تاکہ ملت اسلامیہ کو
جسد بے روح بنا دیا جائے اسی لیے گستاخوں نے پابندی لگوائی اور حق نمک ادا کیا -
ابتک یہ بات چھپی ہوئی تھی کہ گستاخان رسول کا آقایان ولی نعمت سے اندرون خانہ تعلق
و محبت ہے اور سارا الزام امام احمد رضا کے سر تھا مگر اب خلیج کے بحران نے دودھ
کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا ہے گردش دوراں نے دکھا دیا کہ نصاریٰ کے دمساز
امام احمد رضا تھے یا امام احمد رضا کے مخالفین اور انکے ترجمہ قرآن کنز الایمان پر

پابندی لگانے والے ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب

راقم نے اپنے ایک تحقیقی مقالے گناہ بے گناہی (مطبوعہ لاہور 1978ء) میں امام احمد رضا پر انگریز نوازی کے الزام کی تاریخی شواہد کی روشنی میں تحقیق کی ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ امام احمد رضا کا دامن اس داغ سے بے داغ تھا ہاں انکے مخالفین کے دامن ضرور داغدار تھے۔

جب امام احمد رضا نے بعض شرعی وجوہ کی بنا پر ہندوستان کو دار السلام قرار دیا تو ان کے مخالفین نے غل مچایا کیوں کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے ہندوستان کو دار الحرب قرار دے کر بے دست و پائی کے باوجود انگریزوں سے جنگ کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلمان اور کمزور ہو جائیں اور انگریزوں کی نظر میں آجائیں۔ امام احمد رضا نے اپنے فتوے سے ان عزائم کو خاک میں ملا دیا لیکن یہ بات حیران کن ہے کہ جو حضرات انگریزوں کی حکومت میں ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے پر مصر تھے وہ ہندوؤں کی حکومت میں ہندوستان کو دار الاسلام کہہ رہے ہیں یہ تضاد دیکھ کر مولانا کوثر نیازی حیران ہیں:

> "حیرت ہے کہ جو لوگ انگریز کے زمانے میں ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے پر مصر تھے۔ آج ہندو راج میں اسے دار الحرب قرار دینے کا لفظ بھی منہ سے نہیں نکالتے آج ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے والے مفتیان کرام کے وارث مہر بلب ہیں اور اس طرح اپنے عمل سے امام احمد رضا کے فتوے کی تائید کر رہے ہیں (ص 14)

افسوس ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں مذہب کا استحصال کیا گیا جو اب تک جاری

ہے بلکہ اب تو مذہب کے ساتھ ساتھ غربت کا بھی استحصال ہو رہا ہے امام احمد رضا اس استحصال کے خلاف تھے اور وہ زندگی بھر اسکے خلاف نبرد آزما رہے ایسے شخص کو انگریزوں کا حامی و دمساز کہنا کیسی ستم ظریفی ہے۔ امام احمد رضا سیاست داں نہ تھے بلکہ مدبر تھے۔ سیاست داں عوام کا نبض شناس ہوتا ہے اور مدبر زمانے کا نبض شناس، سیاست داں کی نظر عوام پر رہتی ہے اور مدبر کی نظر زمانے پر، دونوں میں یہی فرق ہے اور یہ بہت بڑا فرق ہے ع

ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

مولانا کوثر نیازی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"سب سے پہلے تو اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ امام احمد رضا پالیٹیشن نہیں، اسٹیٹسمین تھے سیاسی لیڈر نہ تھے مدبر تھے پالیٹیشن اور سیاسی لیڈر عوام کی خواہشات کے تابع ہوتے ہیں جب کہ اسٹیٹسمین اور مدبرین پیش بینی کر کے حالات کا رخ متعین کرتے ہیں (ص 13)

یہی پیش بینی اور دور اندیشی تھی کہ جب محمد علی جناح اور ڈاکٹر اقبال متحدہ قومیت کی بات کر رہے تھے، امام احمد رضا نے دو قومی نظریہ کی بات کی ابتدا میں مسلمان سیاسی لیڈروں نے اس کی اہمیت کو نہ سمجھا مگر بعد میں دور اندیش سیاست داں اس طرف آگئے چنانچہ محمد علی جناح اور ڈاکٹر اقبال بھی دو قومی نظریہ کی طرف مائل ہو گئے بلکہ انھوں نے اس کو اپنا فکری اور سیاسی لائحہ عمل بنا لیا مولانا کوثر نیازی اس تاریخی پس منظر پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"انھوں نے متحدہ قومیت کے خلاف اس وقت آواز اٹھائی جب

اقبال اور قائد اعظم بھی اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے دیکھا جائے تو دو قومی نظریہ کے عقیدے میں امام احمد رضا مقتدا ہیں اور یہ دونوں مقتدی۔ پاکستان کی تحریک کو کبھی فروغ حاصل نہ ہوتا اگر امام احمد رضا سالوں پہلے مسلمانوں کو ہندوؤں کی چالوں سے باخبر نہ کرتے (ص 15)

عرصہ ہوا یہ بات راقم نے اپنے ایک انگریزی مقالے میں لکھی تھی جس کا مسودہ مشہور مؤرخ اور ماہر تعلیم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم نے مطالعہ فرمایا انہوں نے سوال کیا کہ کن شواہد کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد علی جناح اور ڈاکٹر اقبال دو قومی نظریہ کے سلسلے میں امام احمد رضا سے متاثر تھے راقم نے یہی جواب دیا کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت کی بات ہو رہی تھی اس وقت امام احمد رضا دو قومی نظریہ کی بات کر رہے تھے جس کا برصغیر کے طول و عرض میں چرچا ہوا اس لئے دونوں حضرات کا ان سے متاثر ہونا بدیہی امر ہے جس کے لئے شواہد کی ضرورت نہیں۔ پھر یہ دونوں امام احمد رضا کے معاصرین میں تھے۔

مولانا کوثر نیازی نے صحیح فرمایا

"ہماری قوم بدقسمتی سے انتہا پسند واقع ہوئی ہے (ص 15)

تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک ترک سیوانات، تحریک کھدر، تحریک ہجرت وغیرہ میں یہی انتہا پسندی نظر آتی ہے۔ امام احمد رضا سیاسی امور میں ہوشمندی اور اعتدال پسندی کے قائل تھے خصوصاً جب کہ ایک عیار اور چالاک اور طاقتور دشمن سے پالا پڑے۔ افسوس یہ ہے کہ سیاسی ہنگامہ آرائی میں ملی شعور مدبروں کے ہاتھ سے نکل کر سیاست دانوں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے پھر وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

مولانا کوثر نیازی امام احمد رضا کے تدبر پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"ایسے میں مخالفتوں اور الزام تراشیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے
مسلک اعتدال پر قائم رہنا اور دو قومی نظریہ کے فروغ کے لئے
مدبرانہ دوربینی کی سیاست پر کاربند رہنا امام احمد رضا جیسے آہنی
اعصاب رکھنے والے انسان ہی کا کام تھا۔ رہا یہ کہنا کہ انکے
اقدامات انگریز نوازی پر مبنی تھے تو یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو یا

تو امام رضا کے مسلک کو سرے سے جانتا ہی نہ ہو یا جانتا ہو مگر
جان کر نہ ماننا چاہتا ہو (ص 16)

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کو سیاسی امور میں یہ بصیرت اور استقامت عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل نصیب ہوئی تھی۔ انکا مسلک، مسلک عشق و محبت تھا، وہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی تھے وہ اسلام کے شیدائی تھے ان کا عشق رسول اس سلام سے عیاں ہے جس کی گونج مشرق و مغرب میں سنی جارہی ہے مولانا کوثر نیازی اس سلام کے لئے لکھتے ہیں

"بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ تمام زمانوں کا پورا نعتیہ کلام ایک طرف اور شاہ احمد رضا کا سلام (مصطفےٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام) ایک طرف دونوں کو ایک ترازو میں رکھا جائے تو احمد رضا کے سلام کا پلڑا پھر بھی جھکا رہے گا"

پھر لکھتے ہیں

مجھے افسوس ہے کہ اہل قلم نے اس جانب توجہ نہیں دی ورنہ اسکے
ایک ایک شعر کی تشریح میں کئی کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔
(ص 11)

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی وجہ سے امام احمد رضا کی شاعری اتنی بلند اور باوقار

ہے کہ آج دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں اس پر کام ہو چکا اور ہو رہا ہے مثلاً پنجاب یونیورسٹی (لاہور) عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن) کلکتہ یونیورسٹی (کلکتہ) اور برمنگھم یونیورسٹی (یو۔کے) وغیرہ اور شاعری پر مقالات و مضامین تو بکثرت شائع ہو چکے ہیں امام احمد رضا کے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانے کے ان عشاق کے متعلق یہ پیشنگوئی فرمائی ہے:

میری امت میں سب سے بڑھ کر مجھ سے محبت رکھنے والے وہ بھی ہونگے جو یہ تمنا کریں گے کہ کاش اپنا مال اور کنبہ قربان کر کے اپنے رسول کو دیکھ لیتے (مشکوٰۃ شریف)

اس حدیث مبارک کو پڑھ کر امام احمد رضا کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں جو انھوں نے گستاخان رسول کے جواب میں کہے ہیں:

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی سے باز رہنا اس شرط پر مشروط رہے کہ اس بندہ خدا کے ساتھ اس کے باپ دادا اکابر علماء قدست اسرارھم کو بھی گالیاں دیں تو این ہم بر علم! اے خوشا نصیب! اسکا کہ اس کی آبرو اسکے آباو اجداد کی آبرو بد گویوں کی زبانوں سے محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کے لئے سپر ہو جائے (حسام الحرمین لاہور ص 52-51)

کسی عارف کامل نے کیا خوب کہا ہے ع

در خیال حضرت جاناں زخود بیزار باش
بے خبر از خوش باش 'باخبر از یار باش!

المختصر مولانا کوثر نیازی کا یہ مقالہ اہل دانش کو دعوت فکر دیتا ہے، امام احمد رضا کی شخصیت کو پرکھنے کا سلیقہ بتاتا ہے اور امام احمد رضا کے فکر و خیال کے مختلف گوشوں کو روشن کرتا ہے اللہ تعلی ہمیں حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ اتحاد و اتفاق کی یہی ایک صورت نظر آتی ہے ع

عطا اسلاف کا جذب دروں کر
شریک زمرہ لایحزنوں کر!

آمین؟

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد
پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج اینڈ پوسٹ
گریجویٹ اسٹڈیز سینٹر، سکھر

اردو زبان میں جب کبھی "آں حضرت" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے سرکار ختمی مرتبت کا وجود باوجود ذہن میں آجاتا ہے اور جب "اعلیٰ حضرت" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے سرکار کے ایک غلام "احمد رضا خان بریلوی" کا نام سامنے آجاتا ہے، دیکھا جائے تو یہ مقام امام احمد رضا خان کو ان کے ماننے والوں کی خوش عقیدگی سے نہیں ملا، یہ ان کے فنافی الرسول اور ایک ہمہ جہت شخصیت ہونے کا فیضان ہے، برصغیر میں یوں تو کئی جامع الصفات شخصیات گزری ہیں مگر جب ایک غیر جانبدار مبصران سب کا جائزہ لیتا ہے تو جیسی ہمہ صفت موصوف شخصیت امام رضا کی نظر آتی ہے ویسی کوئی دوسری نظر نہیں آتی۔

کونسا علم تھا جس پر انہیں دسترس نہ تھی، تفسیر، حدیث، فقہ، ہندسہ، ریاضی، سائنس، فلسفہ، علم ہیئت، جفر، طبیعات، کیمیا، اقتصادیات، ارضیات، طب، جغرافیہ، تاریخ، سیاسیات، علم مناظرہ، منطق، جبر و مقابلہ نحو، صرف، علم معانی، علم بیان، علم صنائع، علم بدائع، قرات، تجوید، تصوف، سلوک، لغت، شاعری، ادب، خط نسخ، خط نستعلیق۔ ان کے سوانح نگاروں نے ساٹھ کے قریب علم گنوائے ہیں جن میں انہیں مہارت تامہ حاصل تھی، وہ بیک وقت ایک عظیم ادیب بھی تھے اور خطیب بھی، مناظر بھی تھے اور متکلم بھی، محدث بھی تھے اور مفسر بھی، فقیہ بھی تھے اور سیاست دان بھی اور جب وہ تحدیث نعمت کے طور پر کہتے ہیں تو غلط نہیں کہتے (اور اس لفظ "سخن" میں کلام کی سبھی شاخیں شامل ہیں) کہ

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں

گردش ایام کی یہ بھی ایک عجیب ستم ظریفی ہے کہ تاریخ کی اکثر و بیشتر عظیم شخصیات مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ مظلوم بھی رہی ہیں' انہوں نے ہمیشہ اپنے باب میں لوگوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے' کسی کو غیر جانبدار نہیں چھوڑا۔ کچھ کو ان سے سخت عقیدت رہی ہے تو کچھ عداوت کی حد تک ان کے مخالف رہے ہیں' اس مخالفت میں ان کی ذات پر پروپگنڈے کی دھول بھی اڑائی گئی ہے' امیرالمومنین حضرت علی المرتضی کو دیکھ لیجئے' نصیری نے انہیں خدا بنادیا تو خوارج نے کافر ٹھہرایا' ہمارے قریبی دور کی مثال محمد علی جناح ہیں چاہنے والوں نے انہیں قائد اعظم کہا اور فتوی بازوں نے انہیں کافر اعظم' یہی صورت حال امام احمد رضا کی شخصیت کے باب میں رہی جو ان کی شخصیت کا عرفان رکھتے ہیں ان کے نزدیک وہ برصغیر کے امام ابو حنیفہ تھے اور جو ان سے مخاصمت کی حد تک مخالفت رکھتے ہیں ان کے نزدیک وہ ایک بدعتی متشدد مفتی اور مناظر اور ایک انگریز نواز مولوی تھے' معاصرت تو ہمیشہ سے سبب منافرت رہی ہے' لیکن افسوس کے ان کی وفات کے اکہتر سال بعد بھی نقد و نظر کا مطلع اب تک گرد آلود ہے' تعصب کی رنگین عینکیں لگا کر دیکھنے والوں نے صاف نظروں سے ابھی تک ان کا روئے تاباں دیکھنے کی کوشش نہیں کی اگر وہ انصاف کرتے تو انہیں یہ جاننے میں کوئی دشواری نہ ہوتی کہ امام رضا کی خلاف پھیلائے جانے والا پروپگنڈا مخالفین کے اپنے دلوں پہ چھائے ہوئے غبار کدورت کا نتیجہ ہے ورنہ خود امام کے زبان و قلم اور قول و فعل سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ تو زبان حال سے یہ پکار رہا ہے ۔

نہ شبنم' نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گو۔
چوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

کیا ستم ظریفی ہے کہ جو رد بدعات میں شمشیر برہنہ تھا' اسے خود حامی بدعات قرار دیا گیا ان کے افکار و فتاوی کا مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ جتنی سخت مخالفت خلاف پیغمبر راہ گزینی کی انہوں نے کی شاید ہی کسی اور نے کی ہو' ان کے ایک معاصر حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے "مرشد" کو سجدہ تعظیمی کے نام سے ایک کتابچہ لکھا تو امام رضا نے "حرمت سجدہ تعظیم" کے نام سے اس کا جواب لکھا اور سو سے زیادہ آیات و احادیث سے اسے حرام ثابت کیا' عام طور پر لوگ پیری مریدی کو اسلام کا لازمہ قرار دیتے ہیں مگر آپ نے اپنی

مشہور کتاب "السنیتہ الانیقہ" میں لکھا ہے کہ :

"انجام کار دستگاری کے واسطے صرف نبی کو مرشد جاننا بس ہے"

اسی طرح ہمارے ہاں قبروں پر چراغاں کیا جاتا ہے مگر امام رضا قبروں پر چراغ جلانے کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ صرف اس صورت اس کے جواز کی قائل ہیں جب قبر رستے میں واقع ہو یا مسجد میں ہو اور اس کی روشنی سے مسافروں اور نمازیوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ آج کل مزاروں پر منوں اور ٹنوں کے حساب سے چادریں چڑھانے کا رواج ہے اور یہ چادریں عام طور پر وزیروں اور امیروں کی دستار بندی میں استعمال کی جاتی ہیں۔ امام احمد رضا قبر پر صرف ایک چادر چڑھانے کی حد تک اس کے جواز کے قائل ہیں۔ ڈھیروں چادریں چڑھانے کو بطور رسم جائز نہیں سمجھتے، لکھتے ہیں :

"جو دام اس میں صرف کریں ولی اللہ کی روح مبارک کو ایصال ثواب کے لیے محتاج کو دیں"

ناواقف لوگ آج کل کی قوالیوں کو بھی امام رضا کے مکتب فکر کی پہچان قرار دیتے ہیں مگر آپ نے اپنے رسالہ "مسائل سماع" میں ان قوالیوں کو ناجائز ٹھہرایا ہے جنہیں مزامیر کے ساتھ سنا جاتا ہے۔

****

کہا جاتا ہے کہ امام احمد رضا بہت متشدد تھے، انہوں نے اپنی کتابوں میں بڑے بڑے علماء اور اکابر کو کافر ٹھہرایا ہے مگر میں کہتا ہوں یہی ایک بات تو انہیں دوسرے مکاتب فکر کے مقابلے میں ممیز اور مشخص کرتی ہے' بدقسمتی سے ہمارے ہاں اکثر لوگ انہیں بریلوی نامی ایک فرقے کا بانی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اپنے مسلک کے اعتبار سے صرف حنفی اور سلفی ہیں اور بس' ان کے مقابلے میں جن لوگوں کو دیوبندی کہا جاتا ہے فقہی مسلک اور اکثر و بیشتر دوسرے مسائل میں وہ بھی وہی نقطہ نظر رکھتے ہیں جو مولانا احمد رضا خان بریلوی کا ہے' پیری مریدی ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہے فیض قبور کا وہ بھی اعتراف کرتے ہیں' عدم تقلید کے وہ بھی مخالف ہیں' امام ابو حنیفہ کی فقہ کو دوسرے تمام فقہی اصولوں پر وہ بھی ترجیح دیتے ہیں۔

اصل جھگڑا یہاں سے چلا کہ ان کے بعض اکابر کے خلافِ احتیاط تحریروں کو امام رضا نے قابل اعتراض گردانا اور چونکہ معاملہ عظمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا‘ توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد پر انہیں فتوؤں کا نشانہ بنایا۔ دیکھا جائے تو یہی فتوے امام بریلوی اور ان کے مکتب فکر کے جداگانہ تشخص کا مدار ہیں‘ جس تشدد کی دہائی دی جاتی ہے وہی ان کی ذات کی پہچان اور پوری حیات کا عرفان ہے‘ وہ فنافی الرسول تھے اس لیے ان کی غیرت عشق احتمال کے درجے میں بھی توہین رسول کا کوئی خفی سے خفی پہلو بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھی‘ دم آخرین اپنے عقیدت مندوں اور وارثوں کو جو وصیت کی وہ بھی یہی تھی کہ :

”جس سے اللہ اور رسول کی شان میں ادنیٰ توہین پاؤ پھر وہ تمہارا کیسا ہی پیارا کیوں نہ ہو فوراً اس سے جدا ہو جاؤ‘ جس کو بارگاہ رسالت میں ذرا بھی گستاخ دیکھو پھر وہ کیسا ہی بزرگ معظم کیوں نہ ہو اپنے اندر سے اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو“ (وصایا شریف)

میں نے صحیح بخاری کا درس مشہور دیوبندی عالم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم و مغفور سے لیا ہے‘ کبھی کبھی اعلیٰ حضرت کا ذکر آجاتا تو مولانا کاندھلوی فرمایا کرتے ”مولوی صاحب! (اور یہ مولوی صاحب ان کا تکیہ کلام تھا) مولانا احمد رضا خان کی بخشش تو انہی فتوؤں کے سبب ہو جائے گی“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ ”احمد رضا خان! تمہیں ہمارے رسول سے اتنی محبت تھی کہ اتنے بڑے بڑے عالموں کو بھی تم نے معاف نہیں کیا تم نے سمجھا کہ انہوں نے توہین رسول کی ہے تو ان پر بھی کفر کا فتویٰ لگا دیا‘ جاؤ اسی ایک عمل پر ہم نے تمہاری بخشش کردی“ کم و بیش اسی انداز کا ایک اور واقعہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی سے میں نے سنا‘ فرمایا:

”جب حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کی وفات ہوئی تو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو کسی نے آکر اطلاع کی‘ مولانا تھانوی نے بے اختیار دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے جب دعا کر چکے تو حاضرین مجلس میں سے کسی نے پوچھا وہ تو عمر بھر آپ کو کافر کہتے رہے اور آپ ان کے لیے دعائے مغفرت کر رہے ہیں‘ فرمایا (اور یہی بات سمجھنے کی ہے) کہ مولانا احمد رضا خان

نے ہم پر کفر کے فتوے اس لیے لگائے کہ انہیں یقین تھا کہ ہم نے توہین رسول کی ہے اگر وہ یہ یقین رکھتے ہوئے بھی ہم پر کفر کا فتویٰ نہ لگاتے تو خود کافر ہو جاتے"

حقیقت میں جسے لوگ امام احمد رضا کا تشدد قرار دیتے ہیں' وہ بارگاہ رسالت میں ان کے ادب و احتیاط کی روش کا نتیجہ ہے' شاعر نے شاعری نہیں کی شریعت کی ترجمانی کی ہے جب یہ کہا ہے کہ ؎

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

اور میرا اپنا ایک شعر ہے ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ دربار نبی ہے
خطرہ ہے بہت سخت یہاں بے ادبی کا

ادب و احتیاط کی یہی روش' امام رضا کی تحریر و تقریر کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے۔ یہی ان کا سوز نہاں ہے جو ان کا حرز جاں ہے ان کا طغرائے ایمان ہے' ان کی آہوں کا دھواں ہے' حاصل کون و مکاں ہے' برتر از این و آں ہے' باعث رشک قدسیاں ہے' راحت قلب عاشقاں ہے' سرمہ چشم سالکاں ہے' ترجمہ کنزالایمان ہے۔

ووجدک ضالا فھدی کے ترجمے کو دیکھ لو' قرآن پاک شہادت دیتا ہے' "ماضل صاحبکم وما غوی" رسول گرامی نہ گمراہ ہوئے نہ بھٹکے۔ "ضل" ماضی کا صیغہ ہے' مطلب یہ ہے کہ ماضی میں آپ کبھی بھی گم گشتہ راہ نہیں ہوئے۔ عربی زبان ایک سمندر ہے اس کا ایک ایک لفظ کئی کئی مفہوم رکھتا ہے ترجمہ کرنے والے اپنے عقائد و افکار کے رنگ میں ان کا کوئی سا مطلب اخذ کر لیتے ہیں۔ "وجدک ضالا" کا ترجمہ ماضل کی شہادت قرآن کو سامنے رکھ کر عظمت رسول کے عین مطابق کرنے کی ضرورت تھی مگر ترجمہ نگاروں سے پوچھو انہوں نے آیت قرآنی سے کیا انصاف کیا ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن ترجمہ کرتے ہیں

"اور پایا تجھ کو بھٹکتا' پھر راہ سمجھائی"

کہا جا سکتا ہے مولانا محمود الحسن ادیب نہ تھے ان سے چوک ہو گئی آیئے ادیب، شاعر اور مصنف اور صحافی مولانا عبد الماجد دریا بادی کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کا ترجمہ ہے۔

"اور آپ کو بے خبر پایا سو رستہ بتایا"۔

مولانا دریا بادی پرانی وضع کے اہل زبان تھے ان کے قلم سے صرف نظر کر لیجئے اس دور میں اردوئے معلی میں لکھنے والے اہل قلم حضرت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے دروازے پر دستک دیجئے، ان کا ترجمہ یوں ہے۔

"اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی"

العیاذ باللہ پیغمبر کی گم رہی اور پھر ہدایت یابی میں جو جو سوسے اور خرخشے چھپے ہوئے ہیں انہیں نظر میں رکھئے اور پھر "کنز الایمان" میں امام احمد رضا خان کے ترجمے کو دیکھئے۔

بیا ورید گر اینجا بود سخن دانے

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

امام نے کیا عشق افروز اور ادب اموز ترجمہ کیا ہے

فرماتے ہیں "اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی"

کیا ستم ہے فرقہ پرور لوگ "رشدی" کی ہفوات پر تو زبان کھولنے سے اور عالم اسلام کے قدم بقدم کوئی کارروائی کرنے میں اس لیے تامل کریں کہ کہیں آقایان ولی نعمت ناراض نہ ہو جائیں، مگر امام احمد رضا کے اس ایمان پرور ترجمہ پر پابندی لگا دیں جو عشق رسول کا خزینہ اور معارف اسلامی کا گنجینہ ہے۔

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

شاعری ایک اور میدان ہے جہاں بے اختیار ادب و احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا ہے اور شاعری میں بھی نعت گوئی کی صنف تو ایک ایسی مشکل صنف سخن ہے جس میں ایک ایک قدم پل صراط پر رکھنا پڑتا ہے، یہاں ایک طرف محبت ہے تو ایک طرف شریعت، ایک شاعر نے روضہ رسول پر اپنی حاضری کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

کس بیم و رجا کے عالم میں طیبہ کی زیارت ہوتی ہے
ایک سمت محبت ہوتی ہے ایک سمت شریعت ہوتی ہے

لیکن یہ کیفیت حقیقت میں صرف روضہ رسول پر حاضری کے وقت ہی طاری نہیں ہوتی ' نعت کہتے وقت ہر شعر اسی امتحان و آزمائش سے دوچار ہوتا ہے ' یہاں بھی ایک طرف محبت ہوتی ہے ایک طرف شریعت ' اگر صرف شریعت کو ملحوظ رکھا جائے تو شعر شعر نہ رہے وعظ و تقریر بن جائے اور اگر صرف محبت کے تقاضے پورے کیے جائیں تو ایک ایک لفظ شریعت کی جراحت کا مجرم ٹھہرے۔ عرفی شیرازی نے اس نازک صورتحال کو اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے ۔

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

" عرفی جلد جلد قدم نہ اٹھا یہ نعت کا میدان ہے ' صحرا نہیں ہے آہستہ آہستہ چل کیونکہ تو تلوار کی دھار پر قدم رکھ رہا ہے۔ "

امام احمد رضا کو بھی اس مشکل کا کامل احساس ہے وہ ملفوظات میں فرماتے ہیں " نعت کہنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے ' بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے۔ " اس لیے ایک جگہ فرمایا " قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی " اس معیار کو سامنے رکھ کر ہم نعتیہ شاعری کے ذخائر پر نظر ڈالتے ہیں تو اس پر صرف ایک ہی شاعر پورا اترتا ہے اور وہ خود احمد رضا خان بریلوی ہیں۔ آپ سب جانتے ہیں میں ادب کا طالب علم ہوں۔ برا بھلا شعر بھی کہہ لیتا ہوں۔ اردو ' عربی ' فارسی تینوں زبانوں کا نعتیہ کلام میں نے دیکھا ہے اور بالاستعیاب دیکھا ہے میں بلاخوف تردید کہتا ہوں کہ تمام زبانوں اور تمام زمانوں کا پورا نعتیہ کلام ایک طرف اور شاہ احمد رضا کا سلام۔

" مصطفٰے جان رحمت پہ لاکھوں سلام "

ایک طرف۔ دونوں کو ایک ترازو میں رکھا جائے تو احمد رضا کے سلام کا پلڑا پھر بھی جھکا رہے گا میں اگر یہ کہوں کہ یہ سلام اردو زبان کا قصیدہ بردہ ہے تو اس میں ذرہ بھر بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ جو

زبان وبیان، جو سوز و گداز، جو معارف و حقائق قرآن و حدیث اور سیرت کے جو اسرار و رموز انداز و اسلوب میں جو قدرت و ندرت اس سلام میں ہے وہ کسی زبان کی شاعری کے کسی شہ پارے میں نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اہل قلم نے اس جانب توجہ نہیں دی ورنہ اس کے ایک ایک شعر کی تشریح میں کئی کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

ایک شعر پڑھتا ہوں میں دعوے سے کہتا ہوں آپ نے کسی زبان کی شاعری میں سرکار ختمی مرتبت کی ریش مبارک کی یہ تعریف نہ سنی ہوگی۔ ذرا تصور کیجئے ایک نہر ہے اس کے اردگرد سبزہ ہے۔ اس سبزے سے نہر کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ اب نہر کس کو کہا۔ سرکار کے دہن مبارک کو، نہر عربی زبان میں دریا کو کہتے ہیں، آپ کے دہن مبارک کو نہر رحمت قرار دیا کہ ایک رحمت کا دریا ہے جو اس دہن اقدس سے موجزن ہے۔ ایک فارسی شاعر نے کہا ہے۔

نرفت "لا" بزبان مبارکش ہرگز
مگر باشہدان لا الہ الا اللہ

آپ کی زبان مبارک سے اشہدان لا الہ الا اللہ میں جو "لا" ہے اس کے علاوہ لا یعنی نہیں کا لفظ کبھی نہیں فرمایا گیا شاہ رضا کہتے ہیں۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
"نہیں" سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

یہ دہن اقدس، یہ نہر رحمت کہ سفر طائف میں پتھروں کی بارش ہوئی، سر مبارک سے خون بہا نعلین مبارک تک آگیا۔ مگر ہاتھ دعا کو اٹھائے۔ عرض کیا۔

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون

"اے اللہ میری قوم کو ہدایت نصیب فرما یہ لوگ نہیں جانتے علم نہیں رکھتے۔ میرے مقام اور پیغام سے بے خبر ہیں۔

تو اس دہن اقدس کو نہر رحمت کہا اور ریش مبارک کیا ہے؟ اس نہر رحمت کے گرد لہلہانے والا سبزہ، جس نے نہر رحمت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اب ایک شعر ملاحظہ فرمایئے

خط کی گرد دہن وہ دل آرا پھبن
سبزہ نہر رحمت پہ لاکھوں سلام

حضرت رضا آگے بڑھتے ہیں۔ سرکار کی، آپ کی ازواج مطہرات کی، صحابہ کرام اہل بیت کی اولیائے کبار کی، بالخصوص حضرت غوث الاعظم کی جو امام الاولیاء ہیں تعریف کرنے کے بعد حرف مطلب زبان پر لاتے ہیں مگر اس میں بھی کیا امتیاز و اختصاص ہے، درخواست ذاتی نہیں جماعتی ہے انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔ صرف اپنے لیے نہیں پوری امت کے لیے ہے کہتے ہیں۔

ایک میرا ہی رحمت پہ دعویٰ نہیں
شاہ کی ساری امت پہ لاکھوں سلام

اور خود کیا چاہتے ہیں؟ یہ سلام اور نعت لکھنے سے غرض کیا ہے؟ کہتے ہیں میں تو صرف اتنا انعام چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن جب سب آپ پر سلام بھیج رہے ہوں وہ فرشتے جو آپ کی خدمت کے لیے مقرر ہیں مجھے آواز دے کر کہیں "احمد رضا! تم بھی تو سلام سناؤ وہی سلام .... مصطفےٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام .... تو میری مزدوری وصول ہو جائے گی۔

کاش محشر میں جب ان کی آمد ہو اور
بھیجیں سب ان کی شوکت پہ لاکھوں سلام
مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں رضا
مصطفےٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام

بات پھیل گئی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مخالفین جس بات کو شاہ احمد رضا کا تشدد کہتے ہیں وہ تشدد نہیں ان کا عشق رسول ہے۔ ان کا ادب و احتیاط ہے جو فتوے نویسی سے لے کر ترجمہ قرآن تک اور ترجمہ قرآن سے لے کر ان کی نعتیہ شاعری تک ہر جگہ آفتاب و ماہتاب بن کر ضوفشانی کر رہا ہے۔

****

اور کہنے والوں کی زبان کون روک سکتا ہے وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت احمد رضا اول و آخر انگریز نواز شخصیت تھے۔ خلافت، ترک موالات، اور تحریک ہجرت اور تحریک ہجرت کی سبھی انقلابی تحریکوں میں ان کی روش انقلاب دشمنی پر مبنی تھی۔ ہندوستان کے دارالسلام اور دارالحرب ہونے کی بحث میں بھی ان کا نقطہ نظر رجعت پسندانہ تھا۔ اس لیے برصغیر کی تحریک آزادی میں انہوں نے محض منفی کردار ادا کیا اور بس!

سب سے پہلے تو اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ امام احمد رضا پالیٹیشین نہیں، اسٹیٹس مین تھے، سیاسی لیڈر نہ تھے، مدبر تھے، پالیٹیشین اور سیاسی لیڈر عوام کی خواہشات کے تابع ہوتے ہیں جبکہ اسٹیٹس مین اور مدبرین پیش بینی کر کے حالات کا رخ متعین کرتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ مذکورہ تحریکیں اپنے اپنے وقت میں جذباتیت کا سیل رواں تھیں مگر ان تحریکوں کا نتیجہ کیا نکلا، تحریک ہجرت پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا رئیس احمد جعفری ندوی نے لکھا ہے۔

"پھر ہجرت کی تحریک اٹھی، اٹھارہ ہزار مسلمان اپنا گھربار، جائیداد، اسباب غیر منقولہ اونے پونے بیچ کر .... خریدنے والے زیادہ تر ہندو ہی تھے، افغانستان ہجرت کر گئے وہاں جگہ نہ ملی واپس کیے گئے، کچھ مر کھپ گئے۔ جو واپس آئے تباہ حال خستہ، درماندہ، مفلس، قلاش، تہی دست، بے نوا، بے یار و مددگار۔ اگر اسے ہلاکت نہیں کہتے تو کیا کہتے ہیں۔"

(حیات محمد علی جناح ص ۱۰۸)

اور تحریک ہجرت اس بحث کا منطقی نتیجہ تھی کہ ہندوستان دارالسلام ہے یا دارالحرب۔ امام احمد رضا اسے دارالحرب قرار نہیں دیتے تھے وہ جانتے تھے کہ اس سے مسلمانوں کے لیے سود کھانا تو جائز ہو جائے گا۔ مگر ہجرت اور تلوار اٹھانا ان پر لازم ہو جائے گا۔ وہ اسے دارالسلام قرار دینے میں سینکڑوں برس مسلمان اس پر حکمران رہے تھے۔ اب بھی سرزمین میں امن تھا اور مسلمانوں کو دینی فرائض کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ حیرت ہے کہ جو لوگ انگریزی زمانے میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے پر مصر تھے آج ہندو راج میں اسے دارالحرب قرار دینے کا لفظ بھی منہ سے نہیں نکالتے۔ مطلب واضح ہے انگریز کے سامنے

ہندو پس پردہ ان فتووں کی تار ہلا رہے تھے جن میں ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا جا رہا تھا تاکہ مسلمان انگریز کے خلاف تلوار اٹھائیں، مر کھپ جائیں اور جو باقی بچیں وہ ہجرت کر کے اس سرزمین ہی کو چھوڑ جائیں۔ آج ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا جائے تو ہندو سیکولرازم کا طلسم پاش پاش ہوتا ہے مسلمان جہاد کے نام پر برسرپیکار ہوں یا ہجرت کریں۔ سیکولرازم کے غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ اس لیے آج ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے والے مفتیان کرام کے وارث مہر بلب ہیں اور اس طرح اپنے عمل سے امام احمد رضا کے فتویٰ کی تائید کر رہے ہیں۔

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کا معاملہ بھی اس سے چنداں مختلف نہیں۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ اس میں ہندوستان سے فوجی بھرتی کرنے کے لیے برطانیہ نے اعلان کیا کہ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے گا ظاہر ہے اس وقت مسلمانوں کے سامنے پاکستان کا نصب العین نہ تھا۔ ہندوستان آزاد ہوتا تو حکومت ہندو اکثریت ہی کی ہوتی یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے فوجی بھرتی کی زبردست حمایت کی اور دو لاکھ کے قریب ہندو اور مسلمان سپاہی انگریزی افواج کے ساتھ مل کر لڑے۔ ترکی کو اس جنگ میں شکست ہوئی۔ فتح پانے کے بعد انگریز وعدے سے پھر گیا۔ اب گاندھی جی اسے سزا دینے کی فکر میں تھے۔ اس مقصد کے لیے خلافت کا مسئلہ ڈھونڈ نکالا گیا۔ حالانکہ سب جانتے تھے کہ ترکی کی سلطنت عثمانیہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے خلافت کے نام پر ایک دھبے سے کم نہیں، مگر یکایک کہا جانے لگا کہ ترکی کا سلطان اسلام کا خلیفہ ہے اور اس کی خلافت ختم کرنا اسلام پر حملہ کرنے کے مترادف ہے۔ مسلمان بھڑک گئے ایک تحریک چل نکلی مگر طرفہ تماشا یہ کہ تحریک کی قیادت گاندھی جی کے ہاتھ میں تھی گویا جو ہندوستان میں ایک الگ خطہ زمین دینے کے حق میں نہ تھا وہ عالمی سطح پر مسلمانوں کی خلافت بحال کرا رہا تھا۔ امام احمد رضا گاندھی کے بچھائے ہوئے اس دام ہمرنگ زمین کو خوب دیکھ رہے تھے انہوں نے متحدہ قومیت کے خلاف اس وقت آواز اٹھائی جب اقبال اور قائداعظم بھی اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے دیکھا جائے تو دو قومی نظریہ کے عقیدے میں امام رضا مقتدا ہیں اور یہ دونوں

حضرات مقتدی۔ پاکستان کی تحریک کو کبھی فروغ حاصل نہ ہوتا اگر امام احمد رضا سالوں پہلے مسلمانوں کو ہندوؤں کی چالوں سے باخبر نہ کرتے۔

یہی صورتحال تحریک ترک موالات کی تھی، گاندھی جی مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر ہر قسم کے بائیکاٹ کے لیے اکسا رہے تھے۔ امام احمد رضا کا موقف یہ تھا کہ موالات دوستی اور محبت کو کہتے ہیں۔ حکم مشرکین اور کفار سے دوستی اور محبت نہ کرنے کا ہے لین دین اور معاملات کے ترک کا نہیں اور جہاں تک دوستی کی ممانعت کا تعلق ہے اس میں انگریز کی تخصیص نہیں اس میں ہندو بھی شامل ہیں۔ ایک مشرک سے پیار کی پینگیں بڑھا کر دوسرے مشرک کا مقاطعہ مسلمانوں کو زیب نہیں دیتا۔

قائداعظم محمد علی جناح تحریک ترک موالات کے مخالف تھے مگر مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی سمیت بہت سے مسلمان رہنما اس مسئلے میں گاندھی کے ساتھ تھے۔ امام احمد رضا کے کلمہ حق سے متاثر ہو کر یہ سیاسی اکابر بھی آہستہ آہستہ ہندو کی سیاست سے باخبر ہوتے چلے گئے۔ خود علامہ اقبال ایک زمانے میں تحریک خلافت کی صوبائی کمیٹی کے صدر تھے۔ مگر جب تحریک کے اصل ہدف سے آگاہ ہوئے تو صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ان کے یہ اشعار اسی دور کی یادگار ہیں۔

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا ہے تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

جس زمانے میں یہ تحریکیں چل رہی تھیں، ان میں عوامی جذبات بھرے ہوئے تھے ویسے بھی ہماری قوم بدقسمتی سے انتہاپسند واقع ہوئی ہے۔ بقول شاعر ؎

افسوس ہم چلے نہ سلامت روی کی چال
یا بے خودی کی چال چلے یا خودی کی چال

ایسے میں مخالفتوں اور الزام تراشیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسلک اعتدال پر قائم رہنا اور دو قومی نظریہ کے فروغ کے لئے مدبرانہ دوربینی کی سیاست پر کاربند رہنا امام رضا خان جیسے آہنی اعصاب رکھنے والے انسان ہی کا کام تھا۔ رہا یہ کہنا کہ ان کے اقدامات انگریز نوازی پر مبنی تھے تو یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو یا تو امام رضا کے مسلک کو سرے سے جانتا ہی نہ ہو یا جانتا ہو مگر جان کر نہ ماننا چاہتا ہو۔ ایک ایسا مردِ مومن جسے انگریزی سامراج سے اتنی نفرت ہو کہ وہ اس کی کچہری میں جانے کو حرام سمجھتا ہو جو مقدمہ قائم ہو جانے کے باوجود اس کی عدالت میں نہ گیا ہو جو خط لکھتا ہو تو کارڈ اور لفافے کی الٹی طرف پتہ لکھتا ہو تاکہ انگریز بادشاہ اور ملکہ کا سر نیچا نظر آئے۔ جس نے اپنی وفات سے دو گھنٹے پہلے یہ وصیت کی ہو کہ اس دالان سے ڈاک میں آئے ہوئے وہ تمام خطوط جن پر ملکہ اور بادشاہ کی تصویر ہے اور روپے پیسے جن پر یہ تصویریں ہیں سب باہر پھینک دیئے جائیں تاکہ فرشتہ ہائے رحمت کو آنے میں دشواری نہ ہو۔ جس نے نعت گوئی میں بھی کسی کو نمونہ مانا اور اسے سلطان نعت گویاں قرار دیا تو حضرت مولانا کفایت علی کافی تھے جنہوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ اس سلسلے میں باقاعدہ جدوجہد کی اور 1858ء میں مراد آباد کے چوک میں انہیں بر سرِ عام پھانسی دیدی گئی۔ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ انگریز کا حامی تھا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ سورج ظلمت، پھول بدبو، چاند گرمی، سمندر خشکی، بہار جھنجھڑ، صبا صرصر، پانی حدت، ہوا حبس اور حکمت جہالت کا دوسرا نام ہے۔

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی
جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

امام احمد رضا کی طبی بصیرت

از حکیم محمد سعید دہلوی

امام احمد رضا کی طبی بصیرت

(از حکیم محمد سعید دھلوی)

مولانا کی شخصیت بہت جامع تھی، وہ اپنے تفقہ اور علم و اطلاع کی وسعت کے اعتبار سے علمائے متاخرین میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے اکثر علمی اور دینی موضوعات پر اہم اور قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن جو تحریریں ان کی شخصیت کی مکمل ترجمانی اور آئینہ داری کرتی ہیں وہ ان کے فتاویٰ ہیں کہ جو متعدد مبسوط اور ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

میرے نزدیک ان کے فتاویٰ کی اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ وہ کثیر در کثیر فقہی جزئیات کے مجموعے ہیں بلکہ ان کا خاص امتیاز یہ ہے کہ ان میں تحقیق کا وہ اسلوب و معیار نظر آتا ہے جس کی جھلکیاں ہمیں صرف قدیم فقہا میں نظر آتی ہیں میرا مطلب یہ ہے کہ قرآنی نصوص اور سنن نبویہ کی تشریح و تعبیر اور ان سے احکام کے استنباط کے لیے قدیم فقہا جملہ علوم وسائل سے کام لیتے تھے، اور یہ خصوصیت مولانا کے فتاویٰ میں موجود ہے آج بھی افتاء اور احکام کی تشریح کرنے والوں کا فرض ہے کہ اسی اصول تحقیق کو اپنے پیش نظر رکھیں اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ کتاب و سنت نے جس نظام حیات کی طرف ہماری رہبری کی ہے اور جو ضابطہ ہمیں عطا کیا ہے وہ مکمل اور دائمی ہے۔ اس کے دوام اور اس کی ہمہ گیری کا تقاضا یہ ہے ہ فقہا کسی چیز کے جواز یا عدم جواز کا فتویٰ دینے سے پہلے ایک ایک لفظ کی تحقیق اس طرح کرلیں کہ اس کا مدلول واضح ہو جائے اور کسی عہد میں تشنگی کا احساس نہ ہو۔ ایسی تحقیق کے لیے ہمیں طبی اور سائنسی علوم کا بھی مطالعہ کرنا ہوگا ورنہ احکام کی وسعت اور دین کی حکمت کا اندازہ دشوار ہوگا۔ قرآن پاک میں تیمم کے لیے "صعید" کا لفظ وارد ہوا ہے۔ جسے مٹی کہتے ہیں مگر مٹی اور جنس ارض کا اطلاق جن جن چیزوں پر ہوتا ہے ان کا تعین علمائے طبیعیات و طب کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جا سکتا۔

فاضل بریلوی کے فتاویٰ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ احکام کی گہرائیوں تک پہنچنے کے

امام احمد رضا کی طبی بصیرت

(از حکیم محمد سعید دھلوی)

مولانا کی شخصیت بہت جامع تھی' وہ اپنے تفقہ اور علم و اطلاع کی وسعت کے اعتبار سے علمائے متاخرین میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے اکثر علمی اور دینی موضوعات پر اہم اور قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن جو تحریریں ان کی شخصیت کی مکمل ترجمانی اور آئینہ داری کرتی ہیں وہ ان کے فتاویٰ ہیں کہ جو متعدد مبسوط اور ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

میرے نزدیک ان کے فتاویٰ کی اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ وہ کثیر در کثیر فقہی جزئیات کے مجموعے ہیں بلکہ ان کا خاص امتیاز یہ ہے کہ ان میں تحقیق کا وہ اسلوب و معیار نظر آتا ہے جس کی جھلکیاں ہمیں صرف قدیم فقہا میں نظر آتی ہیں میرا مطلب یہ ہے کہ قرآنی نصوص اور سنن نبویہ کی تشریح و تعبیر اور ان سے احکام کے استنباط کے لیے قدیم فقہا جملہ علوم و سائل سے کام لیتے تھے' اور یہ خصوصیت مولانا کے فتاویٰ میں موجود ہے آج بھی افتاء اور احکام کی تشریح کرنے والوں کا فرض ہے کہ اسی اصول تحقیق کو اپنے پیش نظر رکھیں اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ کتاب و سنت نے جس نظام حیات کی طرف ہماری رہبری کی ہے اور جو ضابطہ ہمیں عطا کیا ہے وہ مکمل اور دائمی ہے۔ اس کے دوام اور اس کی ہمہ گیری کا تقاضا یہ ہے ہ فقہا کسی چیز کے جواز یا عدم جواز کا فتویٰ دینے سے پہلے ایک ایک لفظ کی تحقیق اس طرح کر لیں کہ اس کا مدلول واضح ہو جائے اور کسی عہد میں تشنگی کا احساس نہ ہو۔ ایسی تحقیق کے لیے ہمیں طبی اور سائنسی علوم کا بھی مطالعہ کرنا ہو گا ورنہ احکام کی وسعت اور دین کی حکمت کا اندازہ دشوار ہو گا۔ قرآن پاک میں تیمم کے لیے "صعید" کا لفظ وارد ہوا ہے۔ جسے مٹی کہتے ہیں مگر مٹی اور جنس ارض کا اطلاق جن جن چیزوں پر ہوتا ہے ان کا تعین علمائے طبیعیات و طب کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جا سکتا۔

فاضل بریلوی کے فتاویٰ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ احکام کی گہرائیوں تک پہنچنے کے

لیے سائنس اور طب کے تمام وسائل سے کام لیتے ہیں اور اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ کس لفظ کی معنویت کی تحقیق کے لیے کن علمی مصادر کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اس لیے ان کے فتاویٰ میں بہت سے علوم کے نکات ملتے ہیں مگر طب اور اس علم کے دیگر شعبے مثلاً کیمیا اور علم الاحجار کو تقدم حاصل ہے اور جس وسعت کے ساتھ اس علم کے حوالے ان کے ہاں ملتے ہیں اس سے ان کی وقت نظر اور طبی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے وہ اپنی تحریروں میں صرف ایک مفتی نہیں بلکہ محقق طبیب بھی معلوم ہوتے ہیں ان کے اس تحقیقی اسلوب و معیار سے دین و طب کے باہمی تعلق کی بھی یہ خوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔

مولانا نے مٹی اور جنس ارض نیز احجار کی تحقیق کے سلسلے میں صرف متقدمین کی تصریحات پر تکیہ نہیں کیا بلکہ ازروئے دیانت علمی احجار و معدنیات اور طب و کیمیا کے مستند علماء کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جو تحقیق کا صحیح انداز ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ کسی شے کی حقیقت و ماہیت ہمیں اس کے ماہرین ہی کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتی ہے ممکن ہے کہ ایک چیز عرف عام میں یا اپنی ظاہر صورت میں پتھر معلوم ہوتی ہو' لیکن اس کی یہ خصوصیت اس کے ماہرین ہی بتا سکتے ہیں اور جب تک ان کا حوالہ نہ دیا جائے اس سے تیمم کے جواز یا عدم جواز کا فتویٰ ہمیشہ محل نظر ہوگا۔ فاضل بریلوی ماہرین فن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مثلاً کہربا جو بظاہر پتھر معلوم ہوتا ہے' مولانا نے اس کی ماہیت ابن سینا اور القافقی جیسے محققین طب سے معلوم کی۔ اس کے بعد یہ فتویٰ دیا کہ یہ پتھر نہیں ہے اس سے تیمم درست نہیں ہے سنگ بصری کے سلسلے میں بھی انہوں نے اسی طرز تحقیق سے کام لیا اور رازی کے حوالے سے یہ بتایا کہ یہ پتھر نہیں سیسے کا دھواں ہے۔ اس سے تیمم نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ابرک چونکہ معدنیات سے ہے اس لیے اس کی ماہیت بھی متعدد اکابر علمائے طب سے معلوم کی اور ان میں ریسقو ایدوس' داؤد انطاکی' رازی' ابن البیطار اور صاحب مخزن جیسے محققین طب ہیں ان کی کتابوں کے مکمل حوالے ہیں اور ابرک کی حقیقت و ماہیت کے ساتھ ان کی اقسام پر مکمل بحث ہے۔ اس طرح ان کے فتاویٰ میں وسعت اور گہرائی کے ساتھ دنی و دینی علوم کا حسن امتزاج ملتا ہے۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک محقق کے لیے یہ بات کہاں تک درست ہو سکتی ہے کہ وہ علمائے طب کی تصریحات پر آنکھ بند کرکے انحصار کرلے تو میں یہ عرض کروں گا ۔ یقیناً یہ بات اصول تحقیق کے خلاف ہے، لیکن یہ بھی عرض کروں گا کہ مولانا اس نکتے سے واقف ہیں اس لیے اطبائے کرام کی تصریحات کا مطالعہ بھی وہ انتقادی نظر سے کرتے ہیں۔ ارسطو نے زجاج کو پتھر کہا اب مولانا کا تعقب ملاحظہ کیجئے۔

"ارسطو زجاج و بلور میں فرق نہیں کرسکا اس لیے وہ بلور کو بھی زجاج ہی کہتا رہا حالانکہ ان میں سے ایک معدنی ہے' ایک مصنوعی دونوں کی ماہیت میں فرق ہے۔"

پھر ابن البیطار اور مخزن کے حوالے پیش کیے ہیں۔

ایک مثال اور ملاحظہ فرمالیجئے: فقہ کی تمام کتابوں میں جن پتھروں سے تیمم کو جائز کہا گیا ہے ان میں ایک نام البلخش بھی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں :-

"کتب لغت حتی کہ قاموس محیط میں اس لفظ کا پتا نہیں۔ نہ تاج العروس نے اس سے استدراک کیا نہ جامع ابن بیطار نہ داؤد انطاکی' و تحفہ و مخزن میں اس کا ذکر۔ عجب یہ کہ کتاب معرب میں بھی اس سے غفلت کی۔ مگر انوار الاسرار میں اس کا تذکرہ نظر آیا (ترجمہ) **بلخش** ایک پتھر ہے جو اطراف مشرق میں سونے کی کان میں ہوتا ہے اس کا رنگ یاقوت احمر کا ہوتا ہے' اور یہ یاقوت سے زیادہ شفاف ہوتا ہے۔ یہ تعریف لعل پر صادق آتی ہے مگر سونے کی کان میں پیدا ہونا ظاہراً اس کے خلاف ہے۔"

مولانا کی طبی بصیرت اور ان کی دقت نظر کا اندازہ مرجان کی تحقیق سے بھی ہوتا ہے مرجان کی حقیقت و ماہیت معلوم کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ دس مستند فقہی کتابوں میں تو اس سے تیمم کے جواز کی صراحت ملتی ہے مگر فتح اور در مختار میں اس سے تیمم کی ممانعت آئی ہے۔

مولانا نے یہ محسوس کیا کہ آخر الذکر فقہا نے مرجان کی حقیقت و ماہیت دریافت کرنے کی کوشش نہیں فرمائی اور ان ماخذ کی طرف رجوع نہیں کیا جن سے مرجان کے بارے میں مستند معلومات حاصل ہوسکیں فقہا بڑی حد تک لغتوں میں الجھ گئے اور نزاع لفظی کے شکار

ہو گئے اگر مرجان کی ماہیت کے لیے کتب طبیہ کی طرف رجوع کیا جاتا تو جواز اور عدم جواز کی متنازعہ صورت حال واقع نہیں ہوتی۔ مولانا نے مرجان سے جواز تیمم کا فتویٰ دیا اور اس کی ماہیت پر طبی کتابوں کی مدد سے مبسوط روشنی ڈالی۔

سب سے پہلے مخزن کے حوالے سے لکھا کہ:

مرجان ایک جسم حجری ہے جو شاخ درخت سے مشابہ ہوتا ہے پھر تحفہ کے حوالے سے لکھا کہ مرجان بسد کو کہتے ہیں اور وہ ایک پتھر ہے جو نباتی قوت کے ساتھ دریا کی گہرائی میں پیدا ہوتا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ علامہ ابن الجوزی مرجان کو عالم نبات اور عالم جمادات کی درمیانی چیز تصور کرتے ہیں داؤد انطاکی کا خیال بھی یہی ہے کہ وہ نباتی اور حجری اشیاء کی درمیانی چیز ہے۔

مولانا نے اطبا کے ان اقوال میں تطبیق کی ایک اچھی صورت نکالی ہے فرماتے ہیں جس طرح کھجور کو کہنا کہ وہ عالم نبات اور عالم حیوانات میں متوسط ہے' نر و مادہ ہوتی ہے اور مادہ جانب نر میل کرتی ہوئی دیکھی جاتی ہے' تلقیع سے بارور ہوتی ہے اسے نبات سے خارج اور حیوانات میں داخل نہیں کرتا' اسی طرح مرجان کو نباتات سے مشابہت کے باوجود اسے احجار سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

اس استدلال کے بعد واضح انداز میں مولانا نے لکھا ہے کہ اصحاب احجار نے اس کے حجر ہونے کی تصریح کر دی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے حجر شجری کہا' شجر حجری کسی نے نہیں کہا۔ مفردات ابن البیطار میں بہ حوالہ ارسطو منقول ہے۔

بسذ و مرجان ایک ہی پتھر ہیں' فرق یہ ہے کہ مرجان اصل ہے' اور بسذ فرع۔

ان تصریحات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اکثر فقہائے کرام نے مرجاں کی ماہیت کا تعین نہیں کیا اسی لیے اختلاف ہوا' مولانا نے اب حجت قاطعہ پیش کر دی ہے' اور طبی کتابوں کی مدد سے اسکی ماہیت کا تعین کر دیا ہے' جسے ہم تحقیق کی جدید تکنیک کہہ سکتے ہیں۔

فتاویٰ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی جزیئے یا مسئلے کا جائزہ مولانا نے سرسری طور پر نہیں لیا اور تقلیدی طور پر اس کے جواز یا عدم جواز کا فتویٰ نہیں دیا' بلکہ اس کی

پوری پوری تحقیق کی مثلاً

فقہا مقبرے کی مٹی سے تیمم کو جائز سمجھتے ہیں، بہ شرطیکہ اس میں کسی قسم کی نجاست نہ ہو، مولانا کا ذہن فوراً گل مختوم کی طرف گیا، جو اصلاً تو مٹی ہے لیکن اس کے بارے میں عجیب و غریب روایات مشہور ہیں، اگر ان کا یقین کرلیا جائے تو پھر اسی مٹی سے یا اس کے ڈھیلوں سے تیمم جائز نہ ہو گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر گل مختوم ہے کیا؟ اور اس کے بارے میں کون سی عجیب و غریب روایات مشہور ہیں۔

چونکہ اطباء گل مختوم کو دواء استعمال کراتے ہیں، اور طبی کتابوں میں اس کی متعدد دوائی خاصیتوں کا بھی ذکر ملتا ہے، اس لیے مولانا نے طب کی امہات کتب سے اس کی ماہیت معلوم کی، تاکہ اس مٹی سے تیمم کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں کوئی فقہی رائے دی جاسکے۔ گل مختوم کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں، اگرچہ حوالہ مذکور نہیں ہے مگر خزانتہ الادویہ میں ہے۔

"بحر مغرب میں ایک جزیرہ لیلون ہے، وہاں ایک معبد ہے جس کی مجاور عورت ہوئی ہے۔ بیرون شہر ایک ٹیلہ ہے جس کی مٹی متبرک خیال کی جاتی ہے وہ عورت تعظیم کے ساتھ اس مٹی کو لاتی اور گوندھ کر اس کی ٹکیاں بنا کر ان پر مہر لگاتی دیقوریدوس وغیرہ نے زعم کیا کہ اس میں بکری کا خون ملتا ہے جالینوس کہتا ہے کہ میں انطاکیہ سے دو ہزار میل سفر کر کے اس جزیرے میں پہنچا میرے سامنے اس عورت نے وہاں سے ایک گاڑی مٹی لی اور ٹکیاں بنائیں اور خون کا کچھ لگاؤ نہ تھا۔ میں نے وہاں کے مؤدب لوگوں اور علماء کے صحبت یافتوں سے پوچھا کہ پہلے کسی زمانے میں اس میں خون ملایا جاتا تھا جس نے یہ سوال سنا مجھ پر ہنسنے لگا۔"

مولانا پر تو اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا کہ اس میں خون نہیں ملایا جاتا اور یہ خالصتاً مٹی ہے، لہٰذا تیمم کے عدم جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن مطالعہ کے دوران انہیں خود اطباء کے اقوال میں خلط آرا کا ایک دلچسپ تماشا نظر آیا، جس کی تنقیح انہوں نے ضروری سمجھی بلاشبہ یہ غلطی داؤد انطاکی سے سرزد ہوئی۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ انطاکی نے مطنئہ

عامہ بیان کیا ہے یا پھر تحقیق سے پہلے کی یہ رائے ہے بہرحال مولانا لکھتے ہیں کہ :۔

"حیرت ہے کہ انطاکی نے اپنی کتاب التذکرہ میں گل مختوم کے اندر خون ملانے کے وھم کو جالینوس کی طرف منسوب کردیا ہے اور تنکابنی نے اپنی کتاب تحفہ میں دیسقوایدوس کی طرف اس کا انتساب کیا جب کہ جالینوس ہی وہ شخص ہے جس نے ذاتی طور پر گل مختوم کی حقیقت معلوم کی اور اس کا عینی مشاہدہ کیا۔"

قرائن یہ کہتے ہیں کہ دیسقوایدوس نے گل مختوم کے بارے میں عام معتقدات کی طرف اشارہ کیا ہوگا اور جالینوس نے اسی کا خیال نقل کردیا ہوگا اس لیے انطاکی نے اسی کی جانب منسوب کردیا اگر جالینوس کو اس کا یقین ہوتا تو وہ جزیرہ مغرب کا سفر کرنے کی صعوبت کیوں اٹھاتا۔

یہ باتیں تو جملہ معترضہ کے طور پر آگئی تھیں جہاں تک مولانا کا تعلق ہے ان کے مطالعہ کی وسعت اور ان کی طبی بصیرت مسلم ہے، تحقیق میں سنجیدگی اور دیانت کی جو مثال انہوں نے قائم کی ہے وہ محققین کے لیے سبق آموز ہے اور سب سے بڑا نقطہ جو سامنے آتا ہی وہ یہ ہے کہ فقہ اور طب کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے اور کوئی شخص اس وقت تک کامل فقیہ نہیں ہو سکتا جب تک اسے طبی علوم پر دسترس نہ ہو' مولانا کے اکثر فتاویٰ سے طبی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔

علم الاحجار والمعادن طب کا ایک اہم شعبہ ہے معدنیات کی تکوینی حقیقت کا علم دقت نظر کا متقاضی ہے وہ صرف احجار کے اسماء تک محدود نہیں ہے بلکہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے ایک بحر بیکراں ہے۔

مولانا کی طبی بصیرت کا ایک اہم ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے عام فقہا کی طرح صرف معدنی احجار کا ذکر نہیں کیا بلکہ اپنی اس اہم تحقیق سے بیان کا آغاز کیا کہ "جملہ معدنیات کا تکون گندھک اور پارے کے امتزاج سے ہے۔ کبریت تو ہے کہ گرم ہے اور پارہ مادہ ۔" کیمسٹری کے علماء شائد انکار نہ کرسکیں کہ جدید علم الکیمیا کا نظریہ بھی یہی ہے اور معدنیات کی تخلیق فطری کیمیائی عمل ہی سے ہوتی ہے۔

تیمم ہی کے ضمن میں رماد یعنی راکھ کی بحث بھی آگئی ہے، جس میں مولانا نے جامع الرموز وغیرہ کے حوالے سے کشتہ سازی کے بھی سارے نکات بیان کر دیئے ہیں۔

مولانا کی اس طبی بصیرت کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فقہا نے جو قابل تیمم اشیاء بتائی تھیں ان پر انہوں نے ۱۰۷ چیزوں کا اضافہ کیا۔

آج فقہاء طبی اور سائنسی علوم سے بیگانگی کی وجہ سے بیشتر تمدنی مسائل میں عصری علوم کے حوالے سے احکام شریعت کی تشریح و تعبیر کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت سے محروم ہیں اور یہ ایک زبردست المیہ ہے غالبًا اسلاف کی زندگیاں ان کے سامنے نہیں ہیں۔

رضا، داغ اور میر

کالی داس گپتا (انڈیا)

رضا، داغ اور میر

کالی داس گپتا (انڈیا)

کالی داس گپتا کا شمار ہندوستان کے بہت ہی معروف شعراء اکرام میں ہوتا ہے آپ طویل مدت تک افریقہ میں قیام پذیر رہے اب واپس ہندوستان تشریف لے آئے ہیں آپ جب واپس بھارت پہنچے تو مولانا احمد رضا کے کلام سے متعارف ہوئے تو پھر آپ نے ان کے نعتیہ کلام "حدائق بخشش" کا مطالعہ کرنے کے بعد امام احمد رضا کو انیسویں صدی کا اردو شاعر میں استاد تسلیم کیا اور اپنے اس مقالہ میں انہوں نے فاضل بریلوی کا استاد داغ دہلوی اور استاد امیر مینائی سے تقابل پیش کیا ہے۔

(ادارہ)

تقریباً ربع صدی کے افریقہ کے قیام کے بعد مجھے ہندوستان پلٹے کوئی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ اس لیے جناب مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کے نام اور کام سے بھی میری واقفیت چند ہی دنوں کی ہے۔ تاہم جب میرے ایک دوست اور عزیز اشتیاق احمد خان اردی نے مجھے مولانا کی دو چھوٹی چھوٹی کتابیں موسومہ حدائق بخشش (حصہ اول و حصہ دوم) برائے مطالعہ عنایت کیں۔ تو معلوم ہوا کہ اسلامی دنیا میں ان کے مقام بلند سے قطع نظر ان کی شاعری بھی اس درجہ کی ہے کہ انہیں انیسویں صدی کے اساتذہ میں برابر کا مقام دیا جائے۔

مولانا موصوف کے سلام اور نعتیں کبھی کبھار سننے میں آجاتے ہیں۔ مگر وہ صرف مذہبی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ باہری حلقوں میں ادبی لحاظ سے نہ ان کو پرکھا جاتا ہے۔ نہ ان سے کسی قسم کا ادبی اور شعری خط اٹھایا جاتا ہے۔ میری شاعری کی عمر بھی ۳۵ سال سے کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے اور میرے ذاتی کتب خانے میں شعر و شاعری سے متعلق تاریخی ادبی، علمی کتابوں اور قدیم و جدید شعراء کے دیوانوں اور تذکروں کا قابل لحاظ اور نادر ذخیرہ موجود ہے۔ جو تقریباً تمام و کمال میری نظر سے گزر چکا ہے۔ مگر مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ حدائق بخشش کے دو نہایت معمولی لکھائی چھپائی والے مجموعوں کے علاوہ مولانا کے ہزاروں

اشعار میں سے ایک حرف بھی میرے ہاں موجود نہیں ہے اور مذکورہ بالا دو مجموعوں کا حال یہ ہے کہ کتابت کی غلطیوں نے بہت سے اشعار کو بے معنی اور وزن سے ساقط کر کے رکھ دیا ہے۔

مولانا کو جان بحق تسلیم ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے مگر کسی تذکرے میں انہیں شعراء کے زمرے میں شمار نہیں کیا گیا صرف ایک جگہ اس کا ذرا سا تعارف نظر آیا وہ بھی براہ راست نہیں۔ بلکہ ان کے چھوٹے بھائی حسن بریلوی مرحوم کے ذریعہ سے (دیکھئے جمخانۂ جاوید جلد اول از لالہ سری رام صفحہ نمبر ۴۵ میں حسن بریلوی کا حال) چونکہ بھائی ہونے کے ناطے حسن مرحوم اور مولانا کا حسب نسب ایک ہی ہے۔ اس لیے یہاں اس ترجمے کا پہلا حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

سخن ور خوش بیان ناظم شیریں زباں مولانا حاجی محمد حسن رضا خان حسن بریلوی خلف مولانا مولوی نقی علی خاں صاحب مرحوم و برادر مولانا مولوی احمد رضا خاں صاحب عالم اہل سنت و شاگرد رشید حضرت نواب فصح الملک بہادر داغ دہلوی۔ آپ کے صاحبزادے نے جو حالات ارسال کیے ان کا خلاصہ یہ ہے۔

آپ ماہ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے آپ کے جد امجد سعادت علی خاں صاحب کی وفات تک تو آپ کے خاندان کا مسکن اسی شہر میں رہا مگر اس کے بعد مستقل سکونت بریلی میں قرار پائی۔ چنانچہ اب وہی وطن ہے۔ آپ کے بزرگوں میں حضرت محمد اعظم علی شاہ صاحب بہت بڑی دولت و ثروت چھوڑ کر تارک الدنیا ہو گئے تھے۔ اور صاحب کشف و کرامات گذرے ہیں اور عاشقانہ رنگ میں بلبل ہندوستان داغ سے تلمذ تھا۔ مولانا حسن بریلوی مرحوم نہایت اچھے شاعر تھے۔ تاہم حیرت ہے کہ اس ضخیم تذکرہ میں ان کے بڑے بھائی "عالم اہل سنت" اور نعت گوئی میں ان کے استاد جناب احمد رضا خان کے مجموعہ جات نے جگہ نہ پائی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خطا اس پاکیزہ مسلک کی بھی ہے جس کے زیر اثر مولانا نے اپنی شاعری کو قطعاً نعتوں اور سلاموں ہی تک محدود رکھا اور باقاعدہ شاعری سے احتراز کیا۔ اس طرح عوام نے انہیں ایک شاعر کی

حیثیت سے جانا ہی نہیں تاہم نعتیں اور سلام ہی سہی ذرا سے غور و فکر کے بعد ان کے اشعار ایک ایسے شاعر کا پیکر دل و دماغ پر مسلط کر دیتے ہیں جو محض ایک سخن ور کی حیثیت سے بھی اگر میدان میں اترتا تو کسی استاد وقت سے پیچھے نہ رہتا۔ نہیں معلوم کہ انہوں نے کسی سے باقاعدہ صلاح لی تھی کہ نہیں تاہم ان کے کلام سے ان کے کامل صاحب فن اور مسلم الثبوت شاعر ہونے میں شبہ نہیں اور نعتیہ غزلیں تو مجتہدانہ درجہ رکھتی ہیں۔ کہیں تشبیہ ہے کہیں خیال گوئی۔ عاشقانہ رنگ کا جو تغزل کی جان ہے ' یہ رتبہ ہے کہ اگر نعت کے مخصوص رنگ کے اشعار الگ کر دیئے جائیں تو بقیہ اشعار ایک بہترین غزل کی شان کے حامل ہوں گے۔ ذیل میں مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

غالب کی مشہور زمین "دل ہی تو ہے نہ سنگ خشت" میں داغ کی بھی ایک غزل گلزار داغ میں ہے جو صحیح معنوں میں زبان داغ کا نمونہ ہے۔ اتفاق سے مولانا احمد رضا خاں کی بھی ایک نعت اسی زمین میں۔ دونوں ہم عہد شاعروں کا بیک وقت لطف اٹھایئے۔ ایک اپنے عہد کا سب سے بڑا استاد غزل اور دوسرا بڑا نعت گو مگر بحیثیت شاعر گمنام۔ چند ہم قافیہ اشعار ہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

داغ ۔

جملہ رفیق و ہم طریق رہزن راہ عشق نہیں
سایہ خضر کیوں نہ ہو ساتھ ہمارے آئے کیوں

رضا ۔

جان سفر نصیب کو کسی نے کہا مزے سے سو
کھٹکا اگر سحر کا ہو شام سے موت آئے کیوں

داغ ۔

عشق و جنوں سے مجھ کو لاگ ہوش و خرد سے اتفاق
پر یہ کہوں تو کیا کہوں میں نے ستم اٹھائے کیوں

رضا ؎

جان ہے عشق مصطفےٰ روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزا ناز دوام اٹھائے کیوں

داغ ؎

ہاں نہیں غیرت رقیب خیر میں بے حیا سہی
جو نہ دوبارہ آسکے بزم سے تیری جائے کیوں

رضا ؎

دیکھ کے حضرت غنی پھیل پڑے فقیر بھی
چھائی ہے اب تو چھاؤنی حشر ہی نہ آجائے کیوں

داغ ؎

لاگ ہو یا لگاؤ ہو کچھ بھی نہ ہو تو کچھ نہیں
بن کے فرشتہ آدمی بزم جہاں میں آئے کیوں

رضا ؎

سنگ در حضور سے ہم کو خدا نہ صبر دے
جانا ہے سر کو جا چکے دل کو قرار آئے کیوں

غالب کا یہ شعر زبان زد عام ہے ؎

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

معانی کے ساتھ طرز ادا بانکپن ایسا ہے کہ اس پر سو غزلیں قربان۔ ردیف گویا اس سے بہتر چسپاں بنیں ہو سکتی۔ مولانا نے غالب کی غزل کے صدقے لفظ "میں" کو "سے" سے بدل کر نعت کہنے کا حق ادا کر دیا ہے نعت اور غزل کو یک جان کرنا اسی کو کہتے ہیں مطلع دیکھئے۔

پھر کے گلی گلی تباہ ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں
دل کو جو عقل دے خدا تیری گلی سے جائے کیوں

داغ کے ہم عصر امیر مینائی کے جو علم و فن میں داغ سے بھی بڑھے ہوئے تھے مشہور مطلعوں میں ایک مطلع یہ ہے اور واقعی بہت خوب ہے۔

جب سے باندھا ہے تصور اس رخ پر نور کا
سارے گھر میں نور پھیلا ہے چراغ طور کا

لیکن مولانا نے تقریباً اسی زمین میں ایسا نعتیہ مطلع کہا ہے کہ مضمون آفرینی کی انتہا کر دی جائے

میل سے کس درجہ ستھرا ہے وہ پتلا نور کا
ہے گلے میں آج تک کورا ہی کرتا نور کا

ایک اور ہم قافیہ شعر

امیر ؎

اے ضبط دیکھ عشق کی انکو خبر نہ ہو
دل میں ہزار درد اٹھے آنکھ تر نہ ہو

رضا ؎

کانٹا مرے جگر سے غم روزگار کا
یوں کھینچ لیجیے کہ جگر کو خبر نہ ہو

امیر کے دیوان مراۃ الغیب کی ایک غزل کے چند ہم قافیہ اشعار ملاحظہ فرمایئے مگر یہ نہ بھولیے کہ امیر کے اشعار ان کی غزل سے لیے گئے ہیں اور مولانا کے ان کی نعتوں سے

امیر ؎

یہ ترو تازہ ہے کہ تمہارا عارض
یہ دھواں دار گھٹا ہے کہ تمہارے گیسو

رضا ؎

سوکھے دھانوں پہ ہمارے بھی کرم ہو جائے
چھائیں رحمت کی گھٹا بن کے تمہارے گیسو
امیر ؔ

بال کنگھی سے جو سلجھائے تو دل الجھایا
تیرہ بختوں کو بگاڑا جو سنوارے گیسو
رضا ؔ

شانہ ہے پنجۂ قدرت تیرے بالوں کے لیے
کیسے ہاتھوں نے شہا تیرے سنوارے گیسو
امیر ؔ

مچھلیاں دام سمجھ کر ہیں جو موجوں میں نہاں
کھل گئے کس کے یہ دریا کے کنارے گیسو
رضا ؔ

تار شیرازہ مجموعہ کونین ہیں یہ
حال کھل جائے جو اکدم ہوں کنارے گیسو
امیر ؔ

دن کو رخسار دکھاتا ہے فروغ خورشید
شب کو چمکاتے ہیں افشاں کے ستارے گیسو
رضا ؔ

تیل کی بوندیں ٹپکتی نہیں بالوں سے رضا
صبح عارض پہ لٹاتے ہیں ستارے گیسو

مندرجہ بالا زمین ردیف کی ثقافت کی وجہ سے ایسی بنجر ہے کہ اس میں رنگ برنگ کے پھول کھلانا ممکن نہیں۔ لہٰذا دونوں کے اشعار میں طراوت و خوش بیانی کا ایک حد تک فقدان ہے لیکن اب ہم مولانا کے چند ایسے نعتیہ اشعار پیش کریں گے۔ جو اساتذہ غزل کی

شان کے ہیں ان میں چستی و بندش، زبان کی گھلاوٹ اور فصاحت و بلاغت کے وہ نمونے ملیں گے کہ لمحہ بھر کے لیے بھولنا پڑے گا کہ یہ اشعار نعتوں کے ہیں۔

شمع یاد رخ جاناں نہ بجھے ۔۔۔ خاک ہو جائیں بھڑکنے والے
کوئی ان تیز رووں سے کہہ دو ۔۔۔ کس کے ہو کر رہیں تھکنے والے
دل سلگتا ہی بھلا ہے اے ضبط ۔۔۔ بجھ بھی جاتے ہیں دہکنے والے
جب گرے منہ سوئے میخانہ تھا ۔۔۔ ہوش میں ہیں یہ بہکنے والے
کام زنداں کے لیے اور ہمیں ۔۔۔ شوق گلزار ہے کیا ہونا ہے
بیچ میں آگ کا دریا حائل ۔۔۔ قصد ان پار ہے کیا ہونا ہے
دل ہمیں تم سے لگانا ہی نہ تھا ۔۔۔ اب سفر بار ہے کیا ہونا ہے
منہ دکھانے کا نہیں اور سحر ۔۔۔ عام دربار ہے کیا ہونا ہے
چھپ کے لوگوں نے کیے جس سے گناہ ۔۔۔ وہ خبر دار ہے کیا ہونا ہے
ان کے نقش پا پہ غیرت کیجئے ۔۔۔ آنکھ سے چھپ کر زیارت کیجئے
ان کے حسن ملاحت پر نثار ۔۔۔ شیرہ جاں کی حلاوت کیجئے
ڈوب کر یاد لب شاداب میں ۔۔۔ آب کوثر کی سباحت کیجئے
سر سے گرتا ہے ابھی بار گناہ ۔۔۔ خم ذرا فرق ارادت کیجئے

مولانا کسی صنف سخن میں پابند نہیں انہوں نے جگہ جگہ صنعتوں کا استعمال بھی کیا ہے۔ رباعی بھی نہایت پختہ کہتے ہیں اس مختصر سے مقالے میں ان سب کی گنجائش نہیں صرف چند ہی رباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ کہے کا پاس رہے۔

محصور جناب دانی و عالی میں ہے کیا شبہ رضا کی بے مثالی میں ہے
ہر شخص کو ایک وصف میں ہوتا ہے کمال بندے کو کمال بے کمالی میں ہے
کس منہ سے کہوں رشک عنادل ہوں میں شاعر ہوں فصیح بے مماثل ہوں میں
حقائی صنعت نہیں آتی مجھ کو ہاں یہ ہے کہ نقصان میں کامل ہوں میں

مولانا نے آئمہ اطہار کی شان میں بھی بہت کچھ لکھا ہے ایک رباعی سنیے

معدوم نہ تھا سایہ شاہ ثقلین
اس نور کی جلوہ گہ تھی ذات حسنین
تمثیل نے اس سایہ کے دو حصے کئے
آدھے سے حسن بنے آدھے سے حسین

امام احمد رضا اور ہم

مولانا محمد قمرالحسن بستوی مصباحی (ایم۔اے)

امام احمد رضا اور ہم

مولانا محمد قمرالحسن بستوی مصباحی (ایم ۔ اے)

متنبی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے ۔ (**ومن صحب الدنیا طویلا تقلبت علی عینہ حتی یری صدقھا کذبا**) "جو دنیا میں عرصہ درانہ تک زندہ رہا تو دنیا اس کی نگاہ میں اس طرح بدل جاتی ہے کہ کل کے سچ کو آج جھوٹ سمجھنے لگتا ہے ۔" بے شمار مشاہدے اس کی توثیق کر دیں گے اور ایسا ہوتا بھی ہے ۔ اردو شاعری نے بھی کہا ہے ؎

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

مگر مشاہدہ عالم میں عجیب عجیب مناظر نگاہوں میں آتے ہیں کتنے لائق بیان' کچھ لائق بیان نہیں احساس بیان نہیں احساس پر بے حسی کا لبادہ ڈال کر دیکھتے جائیے آنکھ بند کر کے گزر جائیے کچھ نہ بولئے ۔ آپ اچھے اگر کہیں زبان کھلی تو دفتر شکایت سننے کو آمادہ رہئے ۔

؎ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

امام احمد رضاؒ کے عرس کی تقریب ہر سال منعقد ہوتی ہے ۔ ہوتی رہے گی ۔ زندہ باد کے نعرے ہر سال لگتے ہیں..... لگتے رہیں گے ۔ خطباء ہر سال مناقب بیان کرتے رہیں گے ۔ اور پورے برصغیر سے عقیدت کیش آتے ہیں.... آتے رہیں گے ۔ امام احمد رضاؒ کا روحانی فیض جاری ہے جاری رہے گا ۔ مگر کیا صرف زندہ باد کے نعرے لگا لینے سے ہم امام احمد رضاؒ کے حقیقی عقیدت کیش ہو سکتے ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے جو ہمارے اور آپ کے سامنے سوالیہ نشان؟ بن کر کھڑا ہوا ہے ۔

پورے ہندوستان میں انجمنیں بنتی ہیں اور سٹیج سجا کر وہی ایک نعرہ بلند کیا جاتا ہے جس کو نصف صدی سے فضاؤں میں تحلیل ہوتا ہوا سنا اور محسوس کیا جا رہا ہے۔ مگر..... کسی نے اس پر غور کیا کہ ہم امام احمد رضاؒ کے آفاقی نظریات کو فضاؤں میں تحلیل ہونے والے نعروں سے زندہ نہیں رکھ سکتے کیونکہ امام احمد رضاؒ نے بنیادی اصولوں کی قدردانی کی ہے اور استحکام پسندی کو گلے لگایا ہے۔ وہ سخت کوش تھے اور سخت کوشی کی ترغیب دیتے تھے۔ وہ بنیادوں کو مستحکم اصول پر رکھنے کے عمل کو تیز سے تیز تر فرماتے تھے۔ ان کی پوری زندگی فکر و نظر کے انہیں پائیدار محاور پر گردش کر رہی ہے اگر ان کی زندگی کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو سال کے ۳۶۳ دن استحکام سازی کے عمل پیہم میں گزرتے اور دو دن خلق خدا کی سیرابی میں صرف ہوتے مگر وہ بھی سوزدروں کی ایسی چاشنی ہوتی کہ محفل میں حاضرباش افراد صفائی قلب کا مرقع بن کر اٹھتے۔

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ امام احمد رضاؒ کی نظر میں صرف انہیں کاموں کی اہمیت تھی جو بنیادی اور ٹھوس ہوتے اگر امام احمد رضاؒ نے زبانی جمع خرچ کیا ہوتا تو اب تک نسلیں ان کو بھول چکی ہوتیں اور ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہو گئی ہوتی مگر انہوں نے خون جگر جلایا۔ لہو کی بوند بوند نسل انسانی کے مستقبل کی تابناکی کے لئے قربان کر دی۔ رات رات لکھتے۔ دن دن لکھتے لمحہ لمحہ لکھتے۔ ہمیشہ لکھتے رہے۔ حتیٰ کہ تصنیفات کا ایک عظیم ذخیرہ ہمیں ھبہ کیا وہ دیکھ رہے تھے کہ قلم کی طاقت اور تحریر کی قوت ذرائع ابلاغ کی جان ہیں قوموں کو زندہ رکھنے کے لئے قلم و کاغذ دوات و روشنائی کا ہتھیار سب سے قیمتی ہوتا ہے لہذا تمام امت مسلمہ کو اس ہتھیار سے لیس کر دیا جائے انہوں نے کیا اور کر کے دکھایا مختلف فنون پر لکھا ہزاروں کی تعداد میں لکھا انمٹ نقوش چھوڑ گئے رہتی دنیا تک کے لئے شعور کا اجالا بخش گئے۔ پوری قوم کا کام کیا یکہ و تنہا کیا یہاں تک کہ آخری لمحات تک کیا۔

انہوں نے افق پر اٹھنے والے غبار سے تند و تیز آندھی اور طوفان کا جائزہ

برسوں پہلے لے لیا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ جب قومیں فضاؤں میں پرواز کے جذبات لے کر اٹھیں قوم مسلم کف افسوس ملتی تماشائی بنی رہے بلکہ اس کو عصری افکار کے ایسے جواہر پارے بخش دیئے جائیں جو ہمہ وقت اس کی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوں اور وقت کی دوڑ میں سب سے آگے نکل سکے علوم جدیدہ قدیمہ کے بیش بہا خزانے وراثت میں چھوڑ گئے امت مرحومہ کو تہی دامن نہ چھوڑا' ہند نژاد مسلمانوں کو ترقی کی راہ میں دوڑنے اور آگے نکل جانے کے تمام تر ذرائع کو اکھٹا کر دیا سواداعظم درغیر پر کاسۂ گدائی لے کر نہ جائے خود کفیل ہو' دوسروں کی اس راہ میں رہنمائی کرے۔ ان کا احساس انہیں کروٹ کروٹ بے چین کئے رہتا اور وہ لمحہ لمحہ اہلسنت وجماعت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتے رہے۔.... مگر.... آج ہم.... کیا کر رہے ہیں؟ کہاں ہیں؟.... کیسے ہیں....؟ کسی کو سوچنے کی فرصت نہیں۔ کسی کو جاننے کا موقع نہیں۔ ہم مبہم خیالات کو سچائی کا روپ دینا چاہتے ہیں واقعیت سے چشم پوشی کر کے حقیقت کا راگ الاپ رہے ہیں۔ وقت سے پہلوتہی کر کے ایک ایسے ماحول کی آبیاری کر رہے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ صفر اور صرف صفر ہے۔

آج کے دور میں جو قوم ذرائع ابلاغ میں خود کفیل ہوتی ہے وہی کامیاب وکامران کہی جاتی ہے۔ اور جو اس سے خالی ہو کوئی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا بلکہ وہ گداگروں کی صف میں شمار ہونے لگتی ہے۔ صرف لکھنا کافی نہیں ہوتا بلکہ اکاڈمیکل کام کی پذیرائی ہوتی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ تصنیف و تالیف کے مراکز قائم کئے جائیں.... **دارلتصنیف والتالیف.. دارالمصنفین' دار الترجمہ...** اکاڈمی جیسے ادارے وجود میں آئیں ان میں ارباب فکر و نظر اور اصحاب قلم کی خدمات حاصل کی جائیں اور وقت کی تیزگامی میں قدم آگے بڑھایا جائے شاید میری یہ بات تلخ ہو مگر سنانے سے مفر نہیں مسلک اہلسنّت و جماعت پوری دنیا کا آفاقی مذہب ہے امام احمد رضاؒ نے اپنے خون جگر سے اسی نظریہ کی آبیاری کی ہم انہیں کے اتباع کہے جاتے ہیں برصغیر ہندوپاک میں جماعت اہلسنّت انہیں کے علامتی نام سے

جانی پہچانی جاتی ہے مگر بہت سارے ایسے ممالک ہیں جہاں امام اہلسنّت کی شخصیت سے لوگ غیر متعارف ہیں ایک دل دوز واقعہ سنیئے اور نظریہ قائم کیجئے کہ ہماری لفظی خلائی پرواز کتنی دور رس ہے۔ ممکن ہے میرے اس قول اور واقعہ سے آپ کو اتفاق نہ ہو مگر مشاہدہ کا انکار سلامت طبعی کی دلیل نہیں۔

الجماهیریہ العربیہ اللیبیہ میں قیام کے دوران ایک روز **کلیتہ الدعوۃ الاسلامیہ** کی لائبریری سے کچھ کتابیں نکالنے ہمارا پورا وفد پہنچا۔ کتابوں کی تلاش میں ہر شخص منہمک تھا۔ راقم الحروف بھی ادھر ادھر کتابوں کے انبار میں نگاہیں مرتکز کئے ہوئے تھا۔ عربی کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ جس میں صرف عربی نسخے ہی موجود مگر دفعتہ میری نگاہ کلیات اقبال اردو پر پڑی۔ نکال کر دیکھا اور رکھ دیا پھر تفاسیر کے درمیان ایک جگہ تفہیم القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودی پر نگاہ پڑی تو وہیں جم کے رہ گئی اس کو نکال کر دیکھا پھر رکھ دیا مگر ذہن میں تیز آندھی چل رہی تھی کہ کہیں امام اہلسنّت کی تصنیفات کا کوئی نسخہ ہاتھ لگے پوری لائبریری چھان ماری مگر کہیں کوئی نسخہ نہ مل سکا میرا ذہن خلاؤں میں مرتعش تھا۔ دماغ میں کرب کا احساس موجزن کتاب لے کر اپنے ہوسٹل واپس ہو گئے پھر کلاس میں اپنے مخصوص استاد علی الصابونی سے میں نے امام اہلسنّت کے بارے میں معلوم کرنا چاہا **انت تعرف من ھوالشیخ احمد رضا؟** "کیا آپ امام احمد رضاؒ کو جانتے ہیں؟" جواب تھا (نہیں) پھر میں نے پوچھا **ھل انت تعلم عن ابی الحسن علی الندوی؟** کیا آپ ابو الحسن ندوی کو جانتے ہیں جواب تھا لا (نہیں) مگر تیسرے سوال کے جواب نے مجھے چونکا دیا **وما ذا رایک عن ابی الاعلی المودودی** "ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے" انہوں نے کہا **نعم انا اعلم کان عالما** "ہاں میں جانتا ہوں وہ ایک عالم تھے پھر میں نے پوچھا **ودون ذالک** "اس کے علاوہ" انہوں نے کہا **لااعلمہ الا لما فقط** "میں انہیں صرف ایک عالم جانتا ہوں" پھر ہم نے اور ہمارے شریک سفر مولانا سیف خالد اشرفی نے امام رضاؒ کا لمبا چوڑا تعارف کرایا اور حضرت کی مشہور زمانہ حمد

الحمد للمتوحد بحلالہ المتفرد

وصلوتہ دوماعلی خیرالانام محمد

سنایا جس پر وہ محظوظ ہوئے (تفصیل کا مقام نہیں پورا مکالمہ کسی اور موقع پر ذکر کیا جائے گا)

آپ اسے صرف ایک واقعہ سمجھ کر نظرانداز نہ کیجئے بلکہ اس کے مبادیات پر نظر ڈالئے تو آپ کی روح کانپ اٹھے گی۔ آپ ایک سرسری تقابلی جائزہ لیجئے۔ مودودی کے بارے میں اتنا معلوم ہونا کہ وہ ایک عالم تھے اور امام احمد رضاؒ کے بارے میں عدم علم کہ میں نہیں جانتا دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے عدم علم سے علم بہرحال بہتر ہوتا ہے جب علم ہے تو مزید کسی دن اس کی معلومات کا شوق پیدا ہو گا پھر شخصیت کے مخفی گوشوں کی تلاش بھی ہوگی۔ مگر جس کے بارے میں کچھ علم نہیں اس طرف ذہن کا التفات کیونکر؟ آخر تفہیم القرآن وہاں کیوں پہنچی؟ جب کہ وہ اردو میں ہے۔ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ اکاڈمیکل کام کی اہمیت اور اس کی ضرورت ہے یہ ذرائع ابلاغ کی توانائی ہی کا کرشمہ تھا کہ جو تفہیم القرآن وہاں پہنچی ورنہ کون جانتا کہ ابولاعلیٰ مودودی کون ہیں؟

امام احمد رضاؒ کی آفاقیت کو بٹہ لگانے میں غیروں سے زیادہ ہمارا اپنا ہاتھ ہے ایک محاسبہ کیجئے پورے ہندوستان کا نہیں صرف بنگال' بہار' یو۔ پی' اڑیسہ اور پاکستان کا اوسط نکالئے سال میں کتنی کانفرنسیں اور کتنے جلسے ہوتے ہیں؟ اور سب کا ایک تخمینہ قائم کیجئے تو آپ کی نگاہ حیرت سے پھٹی رہ جائے گی کہ اخراجات کی شرح لاکھ تک نہیں بلکہ کئی لاکھ تک پہنچتی ہے.... میں جلسوں کا مخالف نہیں۔ جلسے ضرور کئے جائیں کیونکہ ان پڑھ افراد کے درمیان اسلام پہنچانے کا جلسے ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ لیکن اپنی ساری انرجی صرف جلسوں ہی میں نہ جھونکی جائے۔ اس کو ثانویت کا درجہ دیا جائے اور اکاڈمیکل کام کو اولیت کا وہ لاکھوں لاکھ کا سرمایہ جو صرف لفظوں کی آباد کاری میں صرف ہوتا ہے اس کو مستحکم اور ٹھوس کاموں میں صرف کیا

جائے۔

ایک عظیم الشان اکاڈمی دہلی یا بمبئی میں قائم کی جائے جس میں مختلف زبانوں میں اسلام کا کام ہو۔ امام اہلسنّت کی بلند و بالا' عبقری شخصیت کو پوری دنیا میں متعارف کرایا جائے جدید طریقہ کار سے کالجز اور یونیورسٹیز تک امام احمد رضاؒ کے بے داغ حق پر مبنی مسلم الثبوت نظریات پہنچائے جائیں ان کی عربی' فارسی اور تصنیفات کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ امام احمد رضاؒ یقیناً اردو کے ایک عظیم نثار ہیں اور ان کی اردو اردوئے معلّٰی کا مرقع ہے مگر عصر حاضر کی زبان اس کی متحمل نہیں کیونکہ اب اردو میں سہل پسندیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ تعلیمی معیار یا تو انحطاط پذیر ہوا ہے یا پھر اس کے دروبست میں تبدیلی واقع ہوئی ہے ہر زبان دس بیس سال کے بعد ایک انقلابی دور سے گزرتی ہے۔ اسی طرح اردو بھی مسلسل انقلابی ادوار سے گزر رہی ہے۔ اس لئے ان کی اردو تصنیفات کا عصر حاضر کی اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ لوگ خوب سے خوب تر فائدہ حاصل کر سکیں اور ان کی انقلاب آفریں فکر سے ہر شخص آشنا ہو سکے ان کے وہ جدید نظریات جو آج چیلنج کی شکل میں پیش کئے جا سکتے ہیں ان کو سہل اور عام فہم کیا جائے شب و روز اور مسلسل کام کیا جائے۔ تب کہیں جاکر امام رضاؒ کا حق نمک خوارگی ادا ہو سکے گا۔

آج عرب میں دنیا میں السید سابق کی تصنیف فقہ السنہ کا سند کا درجہ حاصل ہے ان کے افکار کو مجتہدانہ عمل تصور کیا جاتا ہے یقیناً فقہ السنہ ایک بہت معیاری کتاب ہے مصنف نے شان اجتہاد سے کام لیا ہے۔ طرز تحریر اور طریقہ استدلال بہت ہی جاذب ہے مگر فتاویٰ رضویہ کا معیار کچھ اور ہی ہے۔ یہاں استدلال کی قوت پر دلیلوں کی طغیانی ہے اور ہر دلیل کسی مجتہد کی فکر رساں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مجتہد اجتہاد کے ذروۂ کمال سے بول رہا ہو اگر فتاویٰ رضویہ کا عربی ترجمہ کیا گیا ہوتا تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ السید سابق کہ فقہ السنۃ سے کم اہمیت اور درجہ سند حاصل نہ ہوا ہوتا..... امام احمد رضاؒ کی فکر پرواز بہت بلند ہے

.... مگر .... آج ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ ہم پانی پر تحریروں اور ہواؤں میں رسم الخط کو ہدیت کا لازمہ قرار دیتے ہیں نیز کاغذ کے پھولوں سے گلاب کی خوشبو حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ ہماری خود فریبی ہے ہم کو میدان عمل میں نکل کر آنا ہو گا اور حقیقت پسندی کا تاج محل تعمیر کرنا ہو گا۔

علاوہ ازیں ہمیں صرف امام رضا" پر ہی نہیں کام کرنا ہے بلکہ اپنے اکابر اسلاف کے ان مخفی خدوخال کو اجاگر کرنا ہو گا جن کی حیات کے درخشاں کارنامے زمانے کی دبیر تہوں میں گم ہوتے جارہے ہیں آج چند بزرگوں کو چھوڑ کر ہماری موجودہ نسل شاید ہی کسی سے واقف ہو ۔ چونکہ جن کے تذکرے کبھی کبھار دو چند ورقی کتابچوں میں نگاہوں سے گزر جاتے ہیں ان کے متعلق ایک دھندلا سا نقش ذہن میں موجود رہتا ہے ۔ مگر کتنے ایسے بزرگ ہیں جن کی زندگی دو ورقی کتابچے میں بھی نہیں آسکی اور وہ پردہ گمنامی میں مبہم ہوتے چلے گئے کتنے تو ایسے ہیں جن کا تذکرہ تواتر سے ہوتا رہتا ہے اس لئے سماعت مانوس رہتی ہے لیکن وہ جن کا ذکر کبھی ہوا ہی نہیں ان کو کیا جانا جاسکے گا ؟ ہم نے گردوپیش سے نگاہیں موندلی ہیں ۔

اگر ہم حریف جماعت کے طریق کار کو دیکھتے تو ہماری نگاہیں کھلتیں ۔ آج ان کے یہاں گڑی ہڈیوں کو تحریر کا جامہ فاخرہ پہنایا جاتا ہے اس پر ڈاکٹریٹ (پی ۔ ایچ ۔ ڈی) کی ڈگری لی جاتی ہے ۔ لیکن ہم طفل تسلی میں زندہ باد .... زندہ باد .... کا انقلاب آفریں نعرہ بلند کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے نظام شمسی کو مسخر کرلیا ہے ۔

صدرالشریعہ مولانہ امجد علی ' حجتہ الاسلام مولانا حامد رضا خاں ' صدرالافاضل مولانا مجاہد حریت ' علامہ فضل حق خیرآبادی ' مولانا عنایت احمد کاکوروی ' مولانا عبدالحق خیرآبادی ' مولانا ارشاد حسین رامپوری ' سید ابوالحسن نوریؒ ' مارہروی ' محدث اعظم مولانا سید محمد میاں کچھوچھوی ' مفتی مظہر اللہ دہلوی ' حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز مرادآبادی ' مولانا حافظ عبدالروف بلیاوی ' مجاہد ملت مولانا حبیب الرحمٰن اڑیسوی ' سید العلماء مارہروی ' مفتی عبدالرشید ناگپوری ' مولانا سید حسینی چندا

رائپوری علیہم الرحمتہ والرضوان وغیرہم کتنے نام شمار کراؤں۔ صفحہ بھر جائے بلکہ دفتر درکار ان پر کیا کام ہوا؟ یہ تو زمانہ قریب کی شخصیتیں ہیں۔ زمانہ بعید کی ہم سے اوجھل ہیں۔ دو نسل گزر جانے کے بعد یہ بھی اوجھل ہو جائیں گی۔ پھر کون یاد کرے گا کہ فلاں بزرگ ایسے تھے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے۔ جب کہ ان پر ایسے دستاویزات مرتب ہونے چاہئے تھے جو مستقبل کی نسلوں کے لئے ہر میدان میں ماخذ کا کام دیتے اور نسلیں ان سے متعارف ہوتیں۔

ابھی چند ہفتہ پہلے جون ۱۹۹۰ء میں بنگلور کے اندر ایک فقہی سیمینار منعقد ہوا۔ رپورٹ شائع ہوئی اس میں اہلسنت و جماعت کا کوئی بھی فرد نظر نہ آیا جب کہ یہ سیمینار غیر جانبدارانہ تھا۔ یہ سیمینار ہم کو منعقد کرنا چاہئے تھا لیکن ہم.... اگر ہم نے اس میدان میں قدم بڑھایا ہوتا عصر حاضر کے ابھرتے ہوئے جدید مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہوتی تو ہم کو کف افسوس نہ ملنا پڑتا، ہم جزوی مسائل میں الجھ کر رہ گئے ہیں اور آفاقیت سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ کیا یہ ہمارے لئے سودمند ہوگا؟ ہرگز نہیں تو پھر اس عمل کو کیوں غیر ضروری سمجھا جا رہا ہے۔ تحقیقی اور اکاڈمیکل کام کی ہر زمانے میں قدروقیمت رہی ہے اور اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

لیبیا کے عالمی مذہبی ادارہ کلیتہ الدعوۃ الاسلامیتہ العالمیتہ کا ایک علمی سیمینار ۲۲ جون کو اس کی راج دھانی طرابلس میں ذاب العماد نامی بلڈنگ میں منعقد ہوا جس کا عنوان **العلمی فی الدارستہ الاسلامیتہ** تھا۔ اس میں متعدد ممالک کے مندوبین شریک ہوئے انہیں میں مصر کے دکتور محمد ذخیلی بھی تھے آپ نے بیش قیمت مقالہ **اصول البحث الاسلامی فی السیرہ النبویتہ** پڑھا۔ ہمارا وفد بھی اس میں سامع کی حیثیت سے موجود تھا۔ جب ڈاکٹر زخیلی صاحب اپنا مقالہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو شریک سفر مولانا سیف خالد اشرفی جانے ان سے سیرت کے متعلق چند سوالات کئے موصوف نے جواب دیا کہ محترم! سیرت پر جتنا کام ہندوستان میں ہوا ہے اتنا کسی بھی ملک میں

نہیں ہوا .... آخر سیرت نگاری سے متعلق ہندوستان کی اہمیت ایک مصری ڈاکٹر کے نزدیک کیوں اجاگر ہوئی ؟ کہ یہاں اس پر اکاڈمیکل کام ہوا ہے جو ایک حقیقت ہے ... .. پھر اگر امام احمد رضا ؒ کے افکار کو اکاڈمک طور پر پیش کیا جائے تو کیا ان کی عبقری شخصیت اور خدمات پر اہل علم نہ سر دھنیں گے بلکہ اعتراف حقیقت ہو گا مگر پہلے انجام تو دیا جائے ۔

پورے ملک سے ارباب حل و عقد کا ایک بورڈ بنایا جائے اس میں مفکرین اور دانشور شامل کئے جائیں قلم کاروں کی خدمات حاصل کی جائیں اور لوگوں کا ذہن اس کی اہمیت کی طرف مبذول کرایا جائے میں جانتا ہوں جو قوم کانفرنس اور جلسہ کے نام پر لاکھوں کا سرمایہ دے سکتی ہے اگر اس کے سامنے افادیت کا یہ پہلو اجاگر کیا جائے تو کیا وہ آپ کو نامراد لوٹا دے گی ؟ نہیں .... بلکہ دل کھول کر آپ کی مدد کرے گی ۔

اس کی زندہ مثال حافظ ملت کا وہ غیر مسخر مستحکم عزم راسخ ہے جس سے انہوں نے اتنا بڑا کام لیا جو اپنی مثال آپ ہے ۔ انہوں نے قوم کو اس کی ضرورت اور افادیت سمجھائی لوگ محسوس کرنے لگے پھر حافظ ملت کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے اور انہوں نے **الجامعۃ الاشرفیۃ** کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا ۔ یہ ہمارے لئے ایک پیغام عمل ہے کاش ارباب نظر سرجوڑ کر بیٹھتے اور وقت کی اس عظیم ضرورت سے قوم کو آشنا کراتے اس ٹیکنالوجیکل دور میں ہر کام تدریجی اور تحقیقی ہو چکا ہے اب لمحوں کو وسعت دے کر زمانہ بیکراں بنایا جاتا ہے اور زمانوں کو سمیٹ کر لمحات کا روپ دیا جاتا ہے ۔ سائنس و کمپیوٹر نے سوچ کا رخ بدل دیا ہے ۔ ہم کو بھی اپنی سوچ کا رخ بدلنا ہو گا ۔ ہم کو چودھویں صدی ہجری کی نصف آخر کی دہائیوں کا خلا اس طرح پر کرنا ہو گا تاکہ مستقبل کی نسلوں میں تشکیک کی راہ جنم نہ لے سکے اور تحقیقی مواد کا ربط امام احمد رضا ؒ کے عصر سے متصف رہے ۔

لکھنے کو تو بہت لکھتا مگر مقالہ کی طوالت کے باعث انہیں چند سطروں پر اکتفاء کر رہا ہوں ۔ خدا کرے قوم مسلم " اہلسنّت و جماعت " کروٹ لے اور تاریخ کا ایک نیا

باب مرتب کرے ۔ ہمارے معزز علماء اور خطباء کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ قوم کے درمیان اس ماحول کو پیدا کریں ۔ جب قوم اپنا معیار ترقی سمجھ لے گی تو آپ کے دوش بدوش وہ ہر منزل پر نظر آئے گی ۔ لفظوں کی بنی دنیا سے تاج محل اور قطب مینار کی تعمیر نہیں ہو سکتی قوم کی مزاج سازی کے لئے جگر کا لہو پلایا جاتا ہے ۔ تب آفتاب و ماہتاب کی برقی کرنیں نمودار ہوتی ہیں ۔

تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ اعلیٰ حضرت کا مسلک صحیح تھا

میاں محمد شفیع م-ش

درود شریف یہ ہے

اَللّٰھُمَّ صَلِّ صَلٰوۃً کَامِلَۃً وَّسَلِّمْ سَلَامًا تَامًّا عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ الَّذِیْ تَنْحَلُّ بِہِ الْعُقَدُ وَتَنْفَرِجُ بِہِ الْکُرَبُ وَتُقْضٰی بِہِ الْحَوَآئِجُ وَتُنَالُ بِہِ الرَّغَآئِبُ وَ حُسْنُ الْخَوَاتِمِ وَیُسْتَسْقَی الْغَمَامُ بِوَجْھِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ فِیْ کُلِّ لَمْحَۃٍ وَّنَفَسٍ بِعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّکَ

(ترجمہ) "یا اللہ درود بھیج کامل اور پورا اسلام بھیج ہمارے سردار حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ اس کے وسیلہ سے مشکلات حل ہو جائیں اور اس کے ذریعہ سے پریشانیاں کھل جائیں اور اس کے وسیلہ سے حاجات پوری ہو جائیں اور اس کے توسل سے تمنائیں بر آئیں اور انجام اچھے ہوں اور بادل آپ کے چہرہ مبارک کی برکت سے برستا ہے اور ان کی آل اور اصحاب پر بھی ہر لمحہ میں

تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ

اعلیٰ حضرت کا مسلک صحیح تھا

میاں محمد شفیع (م۔ ش)

اہل السنت والجماعت کا مرکزی دفتر ٹکسالی گیٹ کے اندر انجمن نعمانیہ ہند کے نام سے کام کرتا تھا۔ اس انجمن کے روح رواں حضرت محرم علی چشتی اور ان کے ساتھی تھے۔ احناف کا مرکز وزیر خاں کی مسجد تھی۔ جس میں حضرت دیدار علی شاہ الوری بھاری بھر کم دینی شخصیت تھے۔ علم و فضل کی بارش فرماتے تھے۔ ان کے دونوں صاحبزادے اور ان کے پیروکار دین حنیف کے معاملے میں کسی قسم کی لچک کے روادار نہیں سید ابو الحسنات اور سید ابو البرکات دین اسلام کے بہت بڑے خادم تھے۔

حضرت سید دیدار علی شاہ صاحب محدث الوری اپنے عقاید میں کوہ ہمالیہ سے زیادہ مضبوط تھے وہ دینی معاملات میں ہلکی سی لغزش بھی برداشت نہیں کرتے تھے اور مسلمہ دینی عقاید سے انحراف پر کفر کا فتویٰ دینے مین تامل نہ کرتے تھے۔

در حقیقت حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ صاحب محدث الوری بریلی کے اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اعلیٰ حضرت ایک بہت بڑے جید عالم دین اور سینکڑوں کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد یا متحدہ قومیت کے دشمن تھے۔ وہ کفر اور اسلام کی کھچڑی کو دل سے ناپسند کرتے تھے۔ اس بناء پر دیو بندی علمائے کرام نے ان کے خلاف طرح طرح کی غلط بیانیاں اور غلط فہمیاں پھیلانے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ کبھی انہیں انگریز کا پٹھو کہا جاتا تھا۔ کبھی انہیں ٹوڈی کہا جاتا اسی بنا پر حضرت سید دیدار علی شاہ صاحب کے خلاف بھی یہ مہم جاری کی گئی کہ وہ برقعہ پہن کر سی آئی ڈی سے اپنی تنخواہ وصول کرنے جاتے ہیں یہ سب کچھ جھوٹ تھا۔ یہ بزرگان دین دراصل اسلام کے سچے خادم اور رسالت کو توحید سے کم تر احترام کا مرکز تسلیم نہیں کرتے تھے۔ (۱۰) جہاں تک

رسالت کا تعلق ہے۔ میرے خیال میں اقبال" عملی طور پر عشق رسول کے پیکر تھے۔ اس لیے انہیں ان بزرگان اسلام کا ہم نوا قرار دیا جاتا تھا آج بھی پاکستان میں اعلیٰ حضرت بریلوی کے بے شمار عقیدت کیش موجود ہیں اور تاریخ کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اعلیٰ حضرت کا مسلک صحیح تھا آج علمائے دیوبند لاکھ تاویلیں کریں لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا حسین احمد مدنی کی زیر قیادت انہوں نے مسلم لیگ کے مقابلے پر کانگرس سے عملی تعاون کیا تھا بہرحال یہ ایک اجتہادی غلطی تھی

جمعہ میگزین روزنامہ نوائے وقت' لاہور
شمارہ ۵ اکتوبر ۱۹۹۰ء ص ۶

---

(۱۰) غالباً میاں صاحب یہ کہنا چاہتے تھے کہ ان بزرگوں کے نزدیک مومن ہونے کے لیے عظمت الوہیت اور عظمت رسالت دونوں کا دل و جان سے ماننا ضروری ہے 'توحید کی عظمت کی آڑ میں تنقیص رسالت کو کسی طرح برداشت نہ کرتے تھے۔ " ۱۲ شرف قادری نقشبندی"

ملک التحریر علامہ ارشد القادری مدظلہ، کے

تأثرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ النبی الصادق الامین ○

پاکستان کے سفر پر روانہ ہوتے وقت جن اداروں کی زیارت کا اشتیاق میں دل میں لیکر چلا تھا ان میں لاہور کی رضا اکیڈمی بھی تھی۔ لاہور میں میرا قیام ملک کی مرکزی درسگاہ جامعہ نظامیہ رضویہ میں تھا۔ یہیں اہل سنت کے شہرہ آفاق مصنف حضرت مولانا عبدالحکیم شرف قادری نے اکیڈمی کے ناظم نشرواشاعت جناب حافظ محمد طاہر صاحب سے میری پہلی ملاقات کرائی، موصوف نہایت ذہین اور متحرک خیال شخصیت کے مالک ہیں۔ ایک کامیاب تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی اور علمی سرگرمیوں سے بھی طبعی اور علمی لگاؤ رکھتے ہیں۔ انہی کی پرخلوص اور صبر آزما جدوجہد نے رضا اکیڈمی کو ایک ملک گیر ادارے میں تبدیل کر دیا ہے۔ اپنے ادارہ کے ساتھ ان کی والہانہ وارفتگی کا اندازہ لگانے کے لئے یہ واقعہ بہت کافی ہے کہ موصوف باہر سے آنے والے دینی اور علمی شخصیتوں کو اپنا ادارہ ضرور دکھلاتے ہیں تاکہ ان سے دعائیں اور مفید مشورے حاصل کریں۔

چنانچہ اپنی روایت کے مطابق انہوں نے مجھے بھی رضا اکیڈمی دیکھنے کی دعوت دی اور میں نے انتہائی جذبۂ مسرت کے ساتھ ان کی دعوت قبول کی اور پروگرام کے مطابق ان کی معیت میں اکیڈمی کے لئے روانہ ہو گیا۔ اکیڈمی کے مرکزی دفتر میں حاضر ہونے کے بعد قابل تحسین نظم و ضبط دیکھ کر مجھے زیادہ خوشی حاصل ہوئی۔ وہیں اکیڈمی کے بانی اور سرپرست اعلیٰ حضرت محترم الحاج محمد مقبول صاحب قادری سے ملاقات ہوئی۔ موصوف قطب مدینہ حضرت عظیم البرکتہ رفیع المنزلتہ مولانا ضیاء الدین احمد قادری علیہم الرحمتہ والرضوان کے دست اقدس پر سلسلۂ عالیہ قادریہ رضویہ کے ساتھ منسلک ہیں۔ عشق رسول کی دولت عظمیٰ اور اعلیٰ حضرت کے ساتھ حسن

عقیدت انہوں نے ولی صفت مرشد برحق سے پائی ہے۔ خود بھی نہایت بزرگ صورت، پاک طینت اور دینی خدمت کا بے پایاں جذبہ رکھنے والے ایک بلند ہمت اور باعمل مرد مومن ہیں۔

ایک عرصہ دراز سے ان کا معمول یہ ہے کہ وہ رمضان المبارک کا موسم نور مدینہ طیبہ میں بسر کرتے ہیں اور مسجد نبوی شریف میں معتکف ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دو مہینے بیت اللہ شریف کی سایہ میں گزارتے ہیں اور حج کی سعادت سے مشرف ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔ ان کی فیروز بختی پر جتنا بھی رشک کیا جائے کم ہے۔ رضا اکیڈمی کے حالات سے باخبر کرنے اور اس کی خدمات کا تعارف کرانے میں وہ بھی پیش پیش تھے۔ مختلف الماریوں میں سجی ہوئی اکیڈمی کی پچاس مطبوعات دیکھ کر بے پایاں مسرت ہوئی۔ یہ مطبوعات مختلف موضوعات پر تھیں لیکن ان کا بیشتر حصہ اعلیٰ حضرت کی حیات اور تعلیمات پر مشتمل تھا۔ دور سے رضا اکیڈمی کی مطبوعات پڑھ کر میں سمجھتا تھا کہ اکیڈمی صرف تصنیف اور اشاعت کا کام انجام دیتی ہے لیکن یہاں آکر اس کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ دارالاشاعت کے علاوہ اکیڈمی کے اہتمام میں چلنے والے بہت سارے ذیلی ادارے بھی ہیں جو مختلف شہروں میں نہایت مستعدی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) جامع مسجد رضا

(۲) مدرسہ ضیاء الاسلام

(۳) رضا فری ڈسپنسری

(۴) تقریبات رضا

(۵) رضا لائبریری

رضا اکیڈمی کے یہ سارے شعبے اپنی افادیت کے اعتبار سے بہت زیادہ قابل قدر ہیں جس شعبے نے ملک کی سرحدوں کو عبور کر کے دنیا کے وسیع خطوں میں مسلک حق کی روشنی پہنچائی ہے وہ اس کی تصنیف و اشاعت کا شبہ ہے۔ اس شعبے نے مجدد دین و ملت امام اہلسنت کے علمی افادات اور ان کے تجدیدی کارناموں کے بے پایاں

وسعتوں میں پھیلا دیا ہے۔

کسی بھی کتاب کے علمی مواد کی قدروقیمت اپنی جگہ پر ہے لیکن کتابت و طباعت اور اگر کاغذ معیاری نہ ہو تو قلم کی ہزار خوبیوں کے باوجود کتاب کی کشش متاثر ہو جاتی ہے لیکن اکیڈمی کی مطبوعات کا جائزہ لینے کے بعد مجھے خوشی ہوئی کہ کتابت و طباعت اور تزئین کاریوں کے رخ سے اکیڈمی کے منتظمین کا ذوق اتنا بلند اور شائستہ ہے کہ ٹائٹل سے لیکر اندر کے صفحات تک کتاب کا ہر حصہ دیدۂ شوق کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتی۔

رضا اکیڈمی اس اعتبار سے بھی بہت زیادہ خوش قسمت ہے کہ اہلسنّت کے بہت سے دانشواران ہندوپاک کی اسے سرپرستی حاصل ہے۔ وقت کے اہم مسائل اور نت نئے موضوعات پر لٹریچر تیار کرنا اور صحیح سمتوں میں اکیڈمی کی رہنمائی کرنا ان کی گرانقدر توجیہات بنیادی حصہ ہے۔

رضا اکیڈمی کی انتظامیہ خصوصیت کے ساتھ جس موضوع کو سرفہرست جگہ دیتی ہے وہ اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت کے تجدیدی کارناموں اور ان کے علمی نوادرات کی نشرواشاعت ہے۔ اس سلسلے میں رضا اکیڈمی کو خصوصیت کے ساتھ پاکستان کے جن اصحاب قلم کی قلمی رفاقت کا شرف حاصل ہے ان میں محقق رضویات پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نقشبندی، حضرت مولانا محمد منشا تابش قصوری اور حضرت مولانا عبدالحکیم شرف قادری کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اس کے ساتھ رضا اکیڈمی پر سب سے بڑا فضل خداوندی یہ ہے کہ مالی سرپرستی کے لئے اسے شہر کے بہت سے فیاض اور صاحب خیر رفقاء مل گئے جو کتابوں کی طباعت میں بھرپور تعاون کرتے ہیں خصوصیت کے ساتھ اکیڈمی کے بانی و سرپرست اعلیٰ الحاج محمد مقبول قادری ضیائی جو خود بھی ایک بہت اچھے صنعت کار ہیں ہر سال ان کی کمائی کا بہت بڑا حصہ رضا اکیڈمی پر صرف ہوتا ہے۔ خدائے قدیر سب کو اجر غیر ممنون سے سرفراز فرمائے۔

یہ اطلاع بھی دنیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے وابستگان مسلک اعلیٰ حضرت

کے لئے باعث مسرت ہو گی کہ اعلیٰ حضرت کی حیات اور تعلیمات پر کام کرنے والا پاکستان کا منفرد ادارہ مرکزی مجلس رضا لاہور جو پچھلی کئی دہائیوں میں بین الاقوامی شہرت کی حامل تھی اس کے ٹوٹ جانے کے بعد رضا اکیڈمی نے بہت حد تک اس کے مشن کو سنبھال لیا ہے۔

مخلصین کا یہ چھوٹا سا قافلہ اس جذبہ اخلاص کے ساتھ سرگرم رہا تو مجھے امید ہے کے ایک دن یہ ادارہ بھی بین الاقوامی سطح پر دنیا سے اپنی قرار واقعی حیثیت منوائے گا۔

میں ادارہ کے منتظمین کو مشورہ دوں گا کہ وہ منصوبہ بندی کے ساتھ اپنے کام کو متعدد میقاتوں پر تقسیم کریں اور اس کے مطابق سرمایہ کی فراہمی اور طباعت و اشاعت کے لئے مواد کی تیاری کا کام شروع کریں۔ طباعت کے لئے مواد کی تیاری سے میری مراد یہ ہے کہ ادارہ کے دانشوروں کی مجلس مشاورت فکر و نظر کی گہرائی میں اتر کر یہ طے کرے کہ ذہن و تہذیب کی بدلتی ہوئی قدروں کو سامنے رکھتے ہوئے کسی موضوع پر لٹریچر کی تیاری کی ضرورت ہے اور وقت کا کون سا نیا فتنہ متقاضی ہے کہ اس کی سرکوبی کی جائے نیز معاشرے کی کون سی اخلاقی بیماری ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس کا علاج کیا جائے۔ اس نظم و ضبط کے ساتھ اگر کام کیا گیا تو ادارہ کی خدمات کی افادیت اور بڑھ جائے گی۔

اپنے تاثرات کی آخری سطریں لکھتے ہوئے صحیح قلب کیساتھ دعا کرتا ہوں کہ توفیق ایزدی اس دارے کی جملہ ضروریات کی کفالت فرمائے اور پردۂ غیب سے اس کے نیک مقاصد کی تکمیل کے لیے ہر طرح کے وسائل پیدا فرمائے اور اکیڈمی کو اس کی ہیئت ترکیب کے ساتھ ہمیشہ زندہ و سلامت رکھے۔ آمین طہٰ و یٰسین

دعا گو مہتمم جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دہلی۔ ۱۵ ذی الحجہ

مہتمم جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء
نئی دہلی
15 ذی الحجہ

تحدیثِ نعمت
ہم سے فقیر بھی اب پھیری کو اُٹھتے ہونگے
اب تو غنی کے در پر بستر جما دیئے ہیں
مُلکِ سخُن کی شاہی تم کو رضا مُسلّم
جس سمت آگئے ہو سکّے بٹھا دیئے ہیں
حضرت احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمۃ